بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہر ماہ کی سات تاریخ کو شائع ہوتا ہے

جولائی سنہ ۱۹۵۶ء

الفرقان

قرآنی حقائق اور اسلامی مسائل بیان کرنیوالا ماہنامہ

ایڈیٹر،

ابوالعطاء جالندھری

معاونین،

(۱) مسعود احمد دہلوی بی۔ اے

(۲) محمد نذیر لائلپوری مولوی فاضل

سالانہ چندہ

پانچ روپے پیشگی

ملنے کا پتہ

ربوہ۔ پاکستان

قیمت رسالہ ھذا

آٹھ آنہ صرف

مندرجات

(۱) حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی قربانی اور اس کے نتائج۔ (عیسائیت اور اسلام میں ایک نئی موازنہ)	ایڈیٹر	ص ۱
(۲) شیعہ سُنّی اختلافات اور حکومت پاکستان	"	ص ۵
(۳) بنی اسرائیل کے اسباط عشرہ کی تلاش قدیم ہندوستان میں	جناب شیخ عبدالقادر صاحب لائلپور	ص ۹
(۴) شذرات	ایڈیٹر	ص ۱۵
(۵) امن کی بنیاد	جناب قاضی محمد اسلم صاحب ایم اے	ص ۱۷
(۶) البیان (قرآن مجید کا سلیس اُردو ترجمہ مختصر تفسیری حواشی کیساتھ)	ابو العطاء	ص ۲۰
(۷) قرآن مجید میں پردہ کے احکام اور ان کا مقصد	محترمہ آمنہ خاتون صاحبہ سالٹ پانڈ۔ افریقہ	ص ۳۳
(۸) ایک نہایت اہم فتویٰ	جناب مولانا حسین احمد صاحب مدنی دیوبند	ص ۴۲

قابلِ توجہ!

بعض مستحق اور نادار شائقین کی درخواستیں دفتر میں موجود ہیں۔ کیا آپ "اعانت الفرقان" میں رقم بھیج کر ایسے اصحاب کے نام رسالہ جاری نہ کروائیں گے؟

—— (مینیجر) ——

ضروری اعلان

رسالہ الفرقان کے بقایا دار حضرات سے درخواست ہے کہ وہ ازراہِ کرم سیدنا حضرت امیر المومنین ایدہ اللہ بنصرہٖ کا سالانہ جلسہ ۱۹۵۵ء کا ارشادِ ذیل بغور ملاحظہ فرمائیں:—

"پھر رسالہ الفرقان ہے جو انصار اللہ کا آرگن ہے۔ انصار اللہ کے معنے ہیں اللہ تعالیٰ کی خاطر اسکے دین کی مدد کرنیوالے لیکن اگر انصار اللہ اپنے رسالہ کی بھی مدد نہیں کرسکتے تو انہوں نے اللہ تعالیٰ کے دین کی کیا خدمت کرنی ہے۔ میرے نزدیک الفرقان جیسا علمی رسالہ ۳۰-۴۰ ہزار بلکہ لاکھ تک چھپنا چاہیئے اور اسکی بہت وسیع اشاعت ہونی چاہیئے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو اسکے معنے یہ ہیں کہ انصار اللہ کو اپنی ذمہ واری کا پورے طور پر احساس نہیں ہے۔" (الفضل ۵ جنوری ۱۹۵۶ء)

ہم یہ عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ اگر خدا نخواستہ کبھی رسالہ الفرقان بند ہوا تو اسکی ذمہ داری محض بقایا دار حضرات پر ہوگی اور انکے نام رسالہ میں شائع کردیئے جائیں گے —— (ایڈیٹر)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جلد ۵ | جولائی ۱۹۵۶ء | الفرقان | ذوالحجہ ۱۳۷۵ھ | شمارہ ۶

عیسائیت اور اسلام میں ایک موازنہ

حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی قربانی اور اس کے نتائج

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے اسلام اور عیسائیت میں خاص مقام ہے۔ آپ کے ایک بیٹے حضرت اسحٰق اسرائیلی سلسلہ کے مورثِ اعلیٰ ہیں اور دوسرے بیٹے حضرت اسمٰعیل کی اولاد میں سے بانیٔ اسلام حضرت خاتم النبیین محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے ہیں۔

بائیبل سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اس وقت وعدہ فرمایا تھا جبکہ حضرت ابراہیمؑ کے کوئی اولاد نہ تھی کہ:-

"اب آسمان کی طرف نگاہ کر اور ستاروں کو گن۔ اگر تو انہیں گن سکے۔ اور اسے کہا کہ **تیری اولاد ایسے ہی ہوگی**"

حضرت ہاجرہؓ سے فرشتہ نے کہا کہ:-

"میں **تیری اولاد کو بہت بڑھاؤنگا** کہ وہ کثرت سے گنی نہ جائے اور خداوند کے فرشتے نے اُسے کہا کہ تو حاملہ ہے اور ایک بیٹا جنے گی اس کا نام اسمٰعیل رکھنا کہ خداوند نے تیرا دُکھ سُن لیا"

(پیدائش ۱۶/۱۰-۱۱)

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ سے فرمایا کہ:-

"میرا عہد جو میرے اور تمہارے درمیان اور تیرے بعد تیری نسل کے درمیان ہے جسے تم یاد رکھو سو یہ ہے کہ تم میں سے ہر ایک فرزند نرینہ کا ختنہ کیا جائے اور وہ فرزند نرینہ جس کا ختنہ نہیں ہوا وہ شخص اپنے لوگوں میں سے کٹ جائے کہ اس نے میرا عہد توڑا"

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کی دُعا پر حضرت اسمٰعیلؑ کے بارے میں فرمایا:-

"اسمٰعیل کے حق میں میں نے تیری سُنی۔ دیکھ میں اسے برکت دوں گا اور اسے **برومند** کروں گا اور اسے **بہت بڑھاؤں** گا اور اس سے بارہ سردار پیدا

ہوں گے اور میں اسے بڑی قوم بناؤں گا۔"

(پیدائش ۱۷ / ۱۰-۱۴، ۲۰)

اِن آیات سے ظاہر ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ کی ولادت الٰہی بشارت سے ہوئی۔ ان کا نام خود اللہ تعالیٰ نے رکھا۔ اور ان کی والدہ اور اُن کے والد سے علیحدہ علیحدہ طور پر خدا نے انہیں بڑھانے، ترقی دینے، برکت بخشنے اور برومند کرنے کا وعدہ فرمایا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ سے اپنے دائمی عہد کا ایک نشان مقرر فرمایا جو ختنہ ہے۔ یہ نشان عیسائیوں اور مسلمانوں میں سے صرف مسلمانوں میں پایا جاتا ہے عیسائیت نے اِس نشان کو مٹا دیا ہے اور اللہ تعالیٰ کے اس عہد کو توڑ ڈالا جو حضرت ابراہیمؑ سے اُن کے اور ان کی اولاد کے بارے میں خدا تعالیٰ نے باندھا تھا۔

اسوقت اسلام اور عیسائیت میں **نقطۂ خلاف** یہ ہے کہ اسلام کے رو سے ابراہیمی وعدوں اور برکات میں حضرت اسحٰقؑ کے ساتھ حضرت اسمٰعیلؑ بھی شریک ہیں اور عیسائیت کہتی ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ ان وعدوں اور ان برکات سے محروم ہیں۔ پولوس رسول نے گلتیوں کے نام اپنے خط میں لکھا ہے:۔

"یہ لکھا ہے کہ ابراہیم کے **دو بیٹے**
تھے۔ ایک **لونڈی** سے دوسرا آزاد
سے۔ مگر لونڈی کا لڑکا جسمانی طور پر اور
آزاد کا لڑکا وعدے کے سبب سے پیدا ہوا
ان باتوں میں تمثیل پائی جاتی ہے۔ اسلئے
کہ یہ عورتیں گویا **دو عہد** ہیں۔ ایک کوہ
سینا پر کی جس سے غلام ہی پیدا ہوتے ہیں
اور وہ **ہاجرہ** ہے۔ اور **ہاجرہ عرب
کا کوہ سینا** ہے اور موجودہ یروشلم
اس کا جواب ہے کیونکہ وہ اپنے لڑکوں
سمیت غلامی میں ہے۔" (گلتیوں ۴/ ۲۴-۲۵)

عیسائیوں کو مسلّم ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ حضرت ابراہیمؑ کے بیٹے ہیں۔ مگر ان کا الزام یہ ہے کہ وہ چونکہ **لونڈی** سے پیدا ہوئے ہیں اسلئے ان کی پیدائش جسمانی طور پر ہے وعدے کے طور پر نہیں ہے۔ یہ الزام واقعات کے لحاظ سے بھی غلط ہے کیونکہ **اوّل** تو حضرت ہاجرہؓ لونڈی نہ تھیں بلکہ مصر کی شہزادی تھیں جنہیں شاہِ مصر نے ازراہِ تواضع حضرت ابراہیمؑ کی "باندی" کہہ کر انکے عقد میں دیا تھا۔ **دوم** سوال تو حضرت ابراہیمؑ کے بیٹے ہونے کا ہے۔ حضرت اسمٰعیلؑ کی ولادت تو اللہ تعالیٰ کے دوہرے وعدہ سے ہوئی تھی جیسا کہ اُوپر کے حوالجات سے ظاہر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ سے عمومی وعدہ فرمایا اور پھر وہی وعدہ حضرت ہاجرہؓ سے فرمایا۔ اور لڑکے کی پیدائش کی خوشخبری دی تھی کہ اس کا نام بھی قبل از پیدائش فرما دیا۔ حضرت ابراہیمؑ نے بچے کا وہی موعود نام رکھا۔ **سوم** عملاً عہد کے لئے جو نشان حضرت ابراہیمؑ سے مقرر کیا گیا تھا وہ نسلِ اسمٰعیلؑ میں آج تک موجود ہے۔ جبکہ عیسائی لوگ اس نشان کو یہ کہہ کر ترک کر چکے ہیں کہ:۔

"میں پولوس تم سے کہتا ہوں کہ اگر تم
ختنہ کراؤ گے تو مسیح سے تم کو کچھ فائدہ نہ

ہوگا۔" (گلتیوں $\frac{5}{4}$)

چہارم ۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ :۔

"میں تجھ کو اور تیرے بعد تیری نسل
کو کنعان کا تمام ملک جس میں تو پردیسی
ہے دیتا ہوں کہ ہمیشہ کے لئے ملک ہو۔
اور میں ان کا خدا ہوں گا" (پیدائش $\frac{17}{8}$)

اس سے ظاہر ہے کہ نسلِ ابراہیم کے لئے ارضِ کنعان وعدہ کی علامت ہے۔ جب صدہا برس سے ارضِ کنعان حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد کے قبضہ میں ہے تو صاف ثابت ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ موعود فرزند ہیں۔ وہ اور انکی اولاد ابراہیمی وعدوں اور برکات کی مستحق ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ صدہا سال سے نسلِ اسحٰق یعنی بنی اسرائیل روحانی برکات سے سراسر محروم ہیں۔ ان میں انبیاء کا سلسلہ منقطع ہوچکا ہے اور اللہ تعالیٰ کے افضال ان کے لئے بند ہوچکے ہیں اور مادی طور پر بھی ارضِ کنعان ان کی ملک سے نکل گیا ہے۔ اور دوسری طرف نسلِ اسمٰعیلؑ روحانی اور جسمانی برکات سے بہرہ اندوز ہوئی ہے جس سے ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کا نسلِ ابراہیمؑ میں سے **ایک عہد** حضرت اسحٰقؑ اور ان کی اولاد سے تھا اور **دوسرا عہد** حضرت اسمٰعیلؑ اور ان کی اولاد سے تھا۔ عرصہ دراز تک نسلِ اسمٰعیلؑ متروک رہی اسلئے اسکو مخاطب کرتے ہوئے خداوند نے فرمایا تھا کہ :۔

"اے بانجھ تو جو جنتی نہ تھی
خوشی سے للکار۔ تو جو حاملہ نہ ہوتی تھی
وجد کر کے گا اور خوشی سے چلا۔ کیونکہ
خداوند فرماتا ہے کہ بیکس چھوڑی ہوئی
کی اولاد خصم والی کی اولاد سے زیادہ
ہے" (یسعیاہ $\frac{54}{1}$)

اور اب نسلِ اسمٰعیل کی نوبت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان میں سے ہی خاتم النبیین یعنی جملہ نبیوں کا سردار مبعوث فرمایا اور اسے رہتی دنیا تک کیلئے کامل شریعت دی اور اب ہر قسم کے روحانی انعامات کے دروازے حضرت اسمٰعیلؑ کی نیک اولاد پر کھلے ہیں۔ درحقیقت یہ سب امور اس عظیم الشان قربانی کے نیک ثمرات ہیں جو حضرت اسمٰعیلؑ نے بارگاہِ رب العزت میں پیش فرمائی تھی۔

بائیبل نے حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی کا نقشہ جس محرفانہ انداز میں پیش کیا ہے وہ پیدائش باب $\frac{21}{}$ آیت ۹–۲۱ میں بالفاظ ذیل درج ہے :۔

"اور سارہ نے دیکھا کہ ہاجرہ مصری کا بیٹا جو اس کے ابرہام سے ہوا تھا ٹھٹھے مارتا ہے۔ تب اس نے ابرہام سے کہا کہ اس لونڈی کو اور اسکے بیٹے کو نکال دے کیونکہ اس لونڈی کا بیٹا میرے بیٹے اضحاق کے ساتھ وارث نہ ہوگا۔ پر ابرہام کو اسکے بیٹے کے باعث یہ بات نہایت بری معلوم ہوئی۔ اور خدا نے ابرہام سے کہا کہ تجھے اس لڑکے اور اپنی لونڈی کے باعث برا نہ لگے۔ جو کچھ سارہ تجھ سے کہتی ہے تو اسکی بات مان کیونکہ اضحاق سے تیری نسل کا نام چلیگا۔ اور اس لونڈی کے بیٹے سے بھی میں ایک قوم پیدا کرونگا اسلئے کہ وہ تیری نسل ہے۔ تب ابرہام نے صبح سویرے اٹھ کر روٹی اور پانی کی ایک مشک لی اور اسے ہاجرہ کو دیا بلکہ اسے اسکے کندھے پر دھر دیا اور لڑکے کو بھی اسکے حوالہ کر کے اسے رخصت کر دیا۔

سو وہ چلی گئی اور بیر سبع کے بیابان میں آوارہ پھرنے لگی۔ اور جب مشک کا پانی ختم ہو گیا تو اس نے لڑکے کو ایک جھاڑی کے نیچے ڈال دیا اور آپ اسکے مقابل ایک تیر کے ٹپے پر دور جا بیٹھی اور کہنے لگی کہ میں اس لڑکے کا مرنا تو نہ دیکھوں۔ سو وہ اسکے مقابل بیٹھ گئی اور چلا چلا کر رونے لگی۔ اور خدا نے اس لڑکے کی آواز سنی اور خدا کے فرشتہ نے آسمان سے پکارا اور اس سے کہا اے ہاجرہ تجھ کو کیا ہوا؟ مت ڈر کیونکہ خدا نے اس جگہ سے جہاں لڑکا پڑا ہے اسکی آواز سن لی ہے۔ اُٹھ اور لڑکے کو اٹھا اور اسے اپنے ہاتھ سے سنبھال کیونکہ میں اسکو ایک بڑی قوم بناؤں گا۔ پھر خدا نے اسکی آنکھیں کھولیں اور اس نے پانی کا ایک کنواں دیکھا اور جا کر مشک کو پانی سے بھر لیا اور لڑکے کو پلایا۔ اور خدا اس لڑکے کے ساتھ تھا اور وہ بڑا ہوا اور بیابان میں رہنے لگا اور تیر انداز بنا۔ اور وہ فاران کے بیابان میں رہتا تھا اور اسکی ماں نے ملک مصر سے اس کے لئے بیوی لی۔"

یہ اقتباس حضرت سارہؓ کے اخلاق کے بارے میں کچھ اچھا تاثر پیدا نہیں کرتا اسلئے اسے اس رنگ میں قابل تسلیم قرار نہیں دیا جا سکتا۔ بہرحال اس سے سیدہ ہاجرہ علیہا السلام اور حضرت اسمٰعیلؑ کی بے کسی، بے بسی اور توکل علی اللہ ظاہر ہے۔ پھر یہ بھی واضح ہے کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے قربان ہونے والے ماں اور اسکے ننھے بچے کو غیر معمولی سامانوں کے ذریعہ سے بچایا۔

صحیح البخاری میں یہ واقعہ خالص قربانی کے رنگ میں بیان ہوا ہے۔ وہ کنواں جس کا ذکر بائیبل کے حوالہ میں ہے وہ زمزم ہے اور وادیٔ فاران مکہ کی وادی ہے۔ اسی جگہ پر باذنِ الٰہی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت ہاجرہؓ اور ان کے شیر خوار بچے اسمٰعیلؑ کو چھوڑا تھا۔

قرآن مجید اور احادیث اور تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمزم کے کنوئیں کی طرف رہنمائی کرکے اس جگہ آبادی کے سامان پیدا کر دیئے۔ مصر جانے والے قافلے وہاں ٹھہرنے لگے اور مکہ آباد ہو گیا اور پھر دنیا میں اوّل بیت للناس کی اساس کو استوار کیا جانے لگا۔ حضرت ابراہیمؑ گاہے گاہے فلسطین سے اس کشتِ وفا و توکل کو لہلہاتے دیکھنے کے لئے آتے تھے۔ انہی دنوں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ نے خدا کے گھر کو مکمل کیا اور اسوقت خداوند تعالیٰ نے انسانی قربانی کی قدیم رسم کو بند کروانے کے لئے حضرت ابراہیمؑ کو خواب دکھائی کہ وہ اپنے بوڑھے اسمٰعیلؑ کو ذبح کر رہے ہیں۔ ہونہار بچے نے اپنی گردن قربانی کے لئے پیش کرتے ہوئے کہا۔ یا ابت افعل ما تؤمر ستجدنی ان شاء اللہ من الصابرین۔ ابا جان! آپ کو جو حکم ہے آپ کر گزریں میں انشاء اللہ صبر اور حوصلہ سے کام لوں گا۔

باپ بھی آمادہ ذبح ہے اور بیٹا بھی مرا ہا قربانی بن رہا ہے۔ روحانیت کا یہی نقطہ تھا جو مطلوب تھا۔ فوراً حکم ہوا۔ یا ابراھیم قد صدقت الرؤیا انا کذالک نجزی المحسنین اے ابراہیم! آپ خواب پورا کر چکے۔ بیٹا ذبیح اللہ بن چکا ہے آپنے اسے بے آب و گیاہ وادی میں چھوڑ کر پہلے ہی ذبح کر دیا تھا انسانی قربانی کے پرانے طریق کو بند کیا جاتا ہے اور اولاد کو دین کیلئے وقف کرکے قربانی کے دروازے کو کھولا جاتا ہے۔

خدا کا گھر خانہ کعبہ تکمیل پذیر ہوا۔ قربانیوں کا طریق جاری ہوا اور حج کا اعلان کیا گیا۔ اور لوگ جوق در جوق چاروں اطراف سے خانہ خدا میں جمع ہونے شروع ہو گئے۔ عورت جو حضرت ہاجرہ علیہا السلام کی اولاد ہیں حضرت اسمٰعیلؑ کی ذریت ہیں جنکے اس قربانی کو یاد رکھے ہیں اور مسلمان دنیا بھر میں پھیل جانے کے باوجود ہر سال حضرت ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی کی یاد کو تازہ کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ہزاروں ہزار سلام ہوں حضرت ہاجرہؓ پر، حضرت ابراہیمؑ پر اور حضرت اسمٰعیلؑ پر [illegible]

تھا یہ ہے ہمارے حج کی یادگار اور یہ ہیں حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانیوں کے نتائج۔ و اٰخر دعوٰنا ان الحمد للہ رب العٰلمین ٭

مقالۂ خصوصی

شیعہ سنی اختلاف اور حکومتِ پاکستان

عقائد و نظریات کی آزادی اساسِ امن و عافیت ہے۔ عقائد کی بحث میں دلیل و برہان کی بجائے تشدد اور سیف و سنان پر اُتر آنا عجز و بطلان کی دلیل ہے۔ قرآن مجید نے باطل سے باطل عقیدہ، شرک، کے خلاف بھی جبر و تشدد کی اجازت نہیں دی۔ بلکہ دلائلِ واضحہ سے اس کی تردید کی اور مشرکین سے ان کے عقیدہ پر برہان کا مطالبہ کیا۔ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ کے واضح اعلان کے بعد مذہب کے بارے میں جبر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

قرآنِ پاک کی اس وضاحت اور صراحت کے باوجود مسلمان فرقوں کا ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما ہونا حیرت انگیز ہے۔ کتنے تعجب کی بات ہے کہ جو رواداری قرآن مجید نے یہود و نصاریٰ سے برتی ہے اور جس طرح انہیں مشترکہ امور میں دعوتِ اشتراک دی ہے آج مسلمان باہم اس رواداری اور اشتراک کے بھی روادار نہیں۔ وہ اپنے چھوٹے چھوٹے اور جزوی اختلافات کو اس قدر بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں کہ یوں نظر آتا ہے کہ ان میں قیامت تک اتحاد و اتفاق کی کوئی صورت نہیں اور وہ زندگی کے کسی مرحلہ میں مل کر بیٹھ نہیں سکتے۔

پاکستان بننے کے بعد مسلمان لیڈروں کا اوّلین فرض تھا کہ اپنی قوم کے عوام میں رواداری کی رُوح پیدا کرتے اور انہیں سکھاتے کہ آزاد قومیں اختلافات برداشت کرنے کی قابلیت رکھتی ہیں۔ وہ جزوی اور فروعی امور پر ایک دوسرے کے ساتھ دست و گریباں نہیں ہوا کرتیں اور اپنی قومی اور ملی وحدت میں کسی قیمت پر رخنہ پیدا نہیں ہونے دیتیں۔ یقیناً یہ مسلمان لیڈروں کا اوّلین فرض تھا۔ سیاسی اور مذہبی زعماء کو سب کام چھوڑ کر اس مقصد کے حصول کے لئے اپنے اوقات کو وقف کر دینا چاہیئے تھا۔ مگر ہوا یہ کہ غلامی کے دیرینہ جراثیم غالب آئے اور مذہبی علماء اور سیاست دان اپنے اپنے مخصوص مقاصد کے پیشِ نظر اختلاف کے شعلوں کو ہوا دینے لگے اور تقریر و تحریر کے ذریعہ اپنے اپنے گروہ کے جذبات کو شدید نفرت میں تبدیل کر دیا۔ اور آج یوں معلوم ہوتا ہے کہ مختلف مذہبی فرقے اور چھوٹے چھوٹے مسلم گروہ ایک دوسرے کے جانی دشمن بن رہے ہیں۔ دیوبندیوں اور بریلویوں میں انتہائی تناؤ نظر آتا ہے اور حکومت طرفین کے ذمہ دار افراد کو گرفتار کرنے پر مجبور ہو رہی ہے۔ احراریوں اور مودودی صاحبان میں چپقلش بڑھ رہی ہے۔ شیعوں اور سنیوں میں فسادات تک نوبت پہنچ چکی ہے۔ حکومت فریقین پر پابندیاں عائد کر رہی ہے اور قیامِ امن کے لئے اپنی مشینری کو حرکت میں لا رہی ہے۔ سنیوں کی انجمن تنظیم اہلسنت، شیعہ حضرات کی انجمن امامیہ سے برسرِ پیکار نظر آ رہی ہے۔ یہ حالات افسوسناک ہیں۔ ان سے ظاہر ہے کہ پاکستان کے مذہبی فرقے کس طرح تنگ ظرفی اور عدم رواداری کا شکار ہو رہے ہیں اور اس طرح ملک کے

اتحاد کو پارہ پارہ کر رہے ہیں۔

شیعوں کا اخبار "صداقت" گو جرہ اسی سلسلہ میں "حکومت کو چوکس ہونا چاہیئے" کے زیر عنوان لکھتا ہے :-

"ختم نبوت کے نام سے جو **تحریک** شروع کی گئی تھی اگر اس وقت بھی ابتداء میں **مُلاؤں کی رسی دراز نہ کی جاتی** تو ملک کو اس قدر **شدید نقصان نہ اٹھانا** پڑتا۔ لیکن تنظیم اہلسنت کی تحریک اس سے بھی خطرناک ہے۔ **قادیانی تو بیچارے آٹے میں نمک کے برابر بھی نہ تھے مگر شیعہ** ملک میں **پینتیس ۳۵ فی صدی** ہیں۔ کوئی قریہ ایسا نہیں جہاں پر شیعانِ حیدر کرار کی آبادی نہ ہو اور وہ عزاداری سید الشہداء نہ کرتے ہوں۔ محرم دن بدن قریب آ رہا ہے مجالسِ عزا منعقد ہوں گی۔ ماتمی جلوس برآمد ہوں گے۔ اگر تنظیم اہلسنت کی رسی یوں ہی دراز رہی تو **زبردست تصادم کا خطرہ** ہے۔ تاریخ اسلامی شاہد ہے کہ **اسلامی سلطنتوں کا زوال ہمیشہ شیعہ سُنّی فساد کی وجہ سے ہوا۔**"

(صداقت - ۵ر جولائی ۱۹۸۱ء)

بلاشبہ یہ درست ہے کہ حکومت کی بروقت کارروائی بہت سے بڑھنے والے فتنوں کو روک دیتی ہے۔ "تحریک ختم نبوت" کی وجہ سے ملک کو شدید نقصان پہنچنے کی یہی وجہ تھی کہ اس وقت کی مذبذب گورنمنٹ کے ایک حصہ نے عمداً اور ایک حصہ نے اپنی سادگی سے اس فتنہ کا بروقت انسداد نہ کیا تھا۔ اب شیعہ سُنّی فسادات کو ابتداء میں ہی سختی اور حزم سے روکنا اشد ضروری ہے اور طرفین کو ملک کے قانون کا احترام سکھانا لازمی ہے۔ شیعہ اخبار نے تحریک ختم نبوت کے وقت احمدیوں کا آٹے میں نمک کے برابر ہونا کہہ کر اور اپنی تعداد پینتیس فیصدی قرار دیکر ملک میں "زبردست تصادم کا خطرہ" ظاہر کیا ہے۔ مطلب یہ کہ شیعہ صاحبان احمدیوں کی طرح صبر و سکون سے کام نہ لیں گے بلکہ اپنی کثرت آبادی کی بناء پر مقابلہ کریں گے۔ اور اس طرح ملک میں فسادات کی آگ پھیل جائیگی۔

اس موقع پر حکومت سے کہنے والی تو یہی بات ہے کہ وہ گزشتہ سے عبرت حاصل کرے اور فسادات کے سدباب کے لئے فسادات کی باتوں کو بھی روک دے۔ پاکستان گزشتہ مارشل لاء میں بہت نقصان اُٹھا چکا ہے۔ اس کی بہت بدنامی ہو چکی ہے اسی وجہ سے بیرونی ممالک میں ہمارے نمائندوں کو بہت سی مشکلات پیش آ رہی ہیں۔ اب نئے فسادات سے ان مشکلات میں اضافہ اور اس بدنامی و نقصان میں زیادتی ناقابلِ برداشت ہے اسلئے حکومت کو چاہیئے کہ فوری طور پر فساد انگیز روش اختیار کرنے والوں کی زبانیں اور قلمیں اور ہاتھ روک دے۔

تنظیم اہل سُنّت کا اخبار "دعوت" ہمارے سامنے نہیں اسلئے معیّن طور پر تو ان سے کچھ نہیں کہا جا سکتا مگر یہ بات تو واضح ہی ہے کہ کثرت تعداد کی بناء پر اخلاقی پابندیوں کو بالائے طاق رکھ دینا اور دوسروں کے مذہبی جذبات کو مجروح کرنا اور اس طرح ملک کو فساد کے شعلوں میں جھونک دینا انتہائی غیر دانشمندی اور اپنے وطن سے غداری ہے سُنّی حضرات

کا فرض ہے کہ کسی مرحلہ پر بھی مذہبی گفتگو کو فساد اور فتنہ کی بنیاد نہ بننے دیں۔ بھلا یہ بھی کوئی تبلیغ ہے کہ فریقین سر پھٹول پر اتر آئیں اور حکومت علماء کو گرفتار کر کے زندان میں محبوس کر دے اور پھر ہم شور مچاتے پھریں کہ حکومت ہمارے مذہبی پیشواؤں کو قید و بند کی صعوبتوں میں مبتلا کر رہی ہے۔ بھائیو! یقیناً یہ کوئی تبلیغ نہیں اور اسلام اس کا ہرگز روادار نہیں قرآن پاک قطعاً اس کی اجازت نہیں دیتا۔ اکثریت میں ہونے کی وجہ سے سنی حضرات کی ذمہ داری بہت زیادہ ہے اور ملکی اتحاد کو محفوظ رکھنا ان کا اوّلین فرض ہے۔ انہیں چاہیئے کہ فوری طور پر شر پسند علماء کی زبانیں اور قلمیں روک دیں اور ملک کو دوسرے شدید خطرہ میں مبتلا نہ ہونے دیں۔

اس جگہ شیعہ حضرات سے بھی گزارش ہے کہ یہ ملک بہرحال ہم سب کا ملک ہے۔ صرف سنیوں یا صرف شیعوں کا نہیں ہے اسلئے پرائے شگون کے لئے ہم اپنا کیوں ناک کٹوائیں۔ آپ کہتے ہیں کہ اکثریت سنیوں کی ہے اور اگر انہوں نے اپنی روش تبدیل نہ کی تو اس ملک میں "زبردست تصادم" ہوگا کیونکہ ہم بھی پاکستان میں پینتیس[۳۵] فی صدی ہیں۔ ہم قادیانیوں کی طرح خاموشی اور صبر و وقار سے "فسادات" کو برداشت نہ کریں گے۔ بھائیو! یہ درست ہے کہ آپ کی تعداد احمدیوں سے زیادہ ہے۔ مگر کیا آپ کے سامنے احمدیوں کے نیک نمونہ کے بہترین ثمرات موجود نہیں؟ کیا احمدیوں کی مظلومیت سے ملک کا امن محفوظ نہیں رہا؟ کیا مفسدین کو عدالتوں تک میں شرمندہ و نادم ہونا پڑا؟ اور کیا خود تحریک احمدیت کے لئے یہ مظلومیت مستقل عمدہ نتائج کی ضامن نہیں بن گئی؟ یہ سچ ہے کہ احمدی تعداد میں کم ہیں۔ مگر کیا یہ واقعہ نہیں کہ اگر ایک ہزار آدمی بھی جان پر کھیل جانے کا فیصلہ کر لے اور صبر و سکون کے دامن کو ہاتھ سے چھوڑ دے تو سارا ملک فساد کی آماجگاہ بن سکتا ہے؟

اب یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ جماعت احمدیہ کا اپنے امام ہمام ایدہ اللہ بنصرہ کے حکم کے مطابق صبر و حوصلہ سے مظالم کو برداشت کر لینا بہت سی برکات کا موجب ہوا ہے پس ہم شیعہ بھائیوں سے کہتے ہیں کہ اگر کبھی انہیں یا کسی اور اقلیت کو ایسی کڑی آزمائش میں سے گزرنا پڑے جس میں سے جماعت احمدیہ کو گزرنا پڑا تو ان کے سامنے جماعت احمدیہ کا بہترین نمونہ اور اس کے عمدہ نتائج موجود ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ شیعہ صاحبان کو تو مظلومیت کے پائدار نتائج کا براہ راست علم ہے بلکہ سچ یہ ہے کہ شیعیت کے قیام اور بقاء کا موجب ہی مظلومیت رہی ہے۔ کیا وہ ملک کے تحفظ اور بقاء کے لئے ایک طبقہ کے عارضی سے شور و غوغا پر صبر و حوصلہ اختیار نہیں کر سکتے۔ اگر ناگوار خاطر نہ ہو تو ہمیں کہنے دیجئے کہ "صداقت" کے انداز تحریر میں بھی اصلاح کی ضرورت ہے۔ بھلا مندرجہ بالا اقتباس کا مضمون زیادہ محتاط الفاظ میں ادا نہیں ہو سکتا۔ اب تو یہ صلح کی کوشش اور حصول انصاف کی سعی کی بجائے تحکم اور دھمکی کا انداز بن کر رہ گیا ہے۔

ہمیں اپنے شیعہ بھائیوں سے بجا شکوہ ہے کہ جب جماعت احمدیہ کے خلاف فساد اور ہنگامہ آرائی ہو رہی تھی اور "بے چارے قادیانی" جو آٹے میں نمک کے برابر بھی نہ تھے بلاوجہ تختۂ مشق ظلم و ستم بنائے جا رہے تھے تو شیعہ حضرات نے توجہ دلائے جانے کے باوجود اس غوغا آرائی کے خلاف

عمومی آواز بلند نہ کی تھی (ہم چند شرفاء کے انفرادی اظہارِ نفرت و بیزاری کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ لکھ رہے ہیں) حالانکہ حالات کا تقاضا تھا کہ اسی وقت اس اکثریت اور اقلیت کے فتنہ کو ختم کر دیا جاتا اور مذہب اور اس کے مقدس عقائد کو ناپاک فساد انگیزی کا موجب بنانے کی اجازت نہ دی جاتی بہرحال وہ وقت تو اللہ تعالیٰ کے فضل سے گزر گیا۔ اب ہم موجودہ حالات میں پُرزور الفاظ میں تمام ان کوششوں کی مذمت کرتے ہیں جو مسلمانوں کے فرقوں کو باہم لڑانے کے لئے کی جا رہی ہیں۔ اور پاکستان میں خونریزی کی ہولی کھیلنا ان کا مقصد ہے۔ تمام مذہبی رہنماؤں کا فرض ہے۔ کہ تمام اختلافات کو دلیل اور بُرہان سے طے کریں اور کبھی بھی اپنے پیروؤں کو دوسروں پر تعدّی، ظلم اور تشدّد کرنے کی تلقین نہ کریں۔ یہ ظالمانہ رویّہ آخرکار ظالم کے حق میں ہی مہلک اور خطرناک ثابت ہوتا ہے۔

ہمیں توقع ہے کہ شیعہ اور سُنّی حضرات ہماری معقول آواز پر کان دھریں گے۔ اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ وہ سب کو عقل و سمجھ عطا فرمائے اور پاکستان کو استحکام اور دائمی بقا بخشے۔ آمین +

نصرتِ اسلام کیلئے دعوت

(از کلام حضرت مسیح موعود علیہ السلام بانی سلسلہ احمدیہ)

بیکسے شد دینِ احمد ہیچ خویش و یار نیست
ہر کسے در کارِ خود با دینِ احمد کار نیست

ہر طرف سیلِ ضلالت صد ہزاراں تن ربود
حیف بر چشمیکہ اکنوں نیز ہم ہشیار نیست

اے خداوندانِ نعمت ایں چنیں غفلت چرا ست
بیخود از خوابید یا خود بختِ دیں بیدار نیست

اے مسلماناں خدا را یک نظر بر حالِ دیں
آنچہ مے بینم بلا ہا حاجتِ اظہار نیست

آتش افتادہ ست در دینِ حریمِ بیدلے یاں
دیدِ ایش اند و ہد کار مردم دیندار نیست

ہر زماں از بہرِ دیں در خونِ دلِ من مے تپد
محرمِ ایں دردِ ما جز عالم الاسرار نیست

آنچہ بر ما مے رود از غم کہ داند جز خدا
زہر مے نوشیم لیکن زہرہ گفتار نیست

ہر کسے غمخوارئ اہل و اقارب میکند
اے دریغ ایں بیکسے را ہیچ کس غمخوار نیست

خونِ دیں بینم رواں چوں کشتگانِ کربلا
اے عجب ایں مرد ماں را ہیچ آں آزار نیست

حیرتم آید چو بینم بذلِ شاں در کارِ نفس
کایں ہمہ جود و سخاوت در رہِ ادار نیست

اے کہ داری مقدرت ہم عزم تائیداتِ دیں
لطف کن ما را نظر بر اندکے بسیار نیست

بیں کہ چوں در خاک مے غلطد زجورِ ناکساں
آں کہ مثلِ او بزیر گنبدِ دوّار نیست

اندریں وقتِ مصیبت چارۂ ما بیکساں
جز دُعائے بامداد و گریۂ اسحار نیست

بنی اسرائیل کے اسباطِ عشرہ کی تلاش قدیم ہندوستان میں

آرامی زبان، آرامی رسم الخط اور آرامی انجیل کے آثار

(۲)

(از جناب شیخ عبدالقادر صاحب لائل پور)

مضمون کے پہلے حصہ میں یہ ذکر آچکا ہے کہ قدیم ہندوستان کے شمال مغرب میں بسنے والے بنی اسرائیل کی زبان آرامی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس علاقہ میں اس زبان کے آثارِ قدیمہ بکثرت برآمد ہوئے ہیں۔ آرامی زبان اور آرامی حروف میں سنگِ مرمر کا ایک ہشت پہلو کتبہ ٹیکسلا کی کھدائیوں میں ملا ہے۔ اسی طرح بہت سے ظروف، سکے اور کتبے ملے ہیں جو کہ خروشتی حروف پر مشتمل ہیں۔ یہ مسلمہ ہے کہ خروشتی رسم الخط آرامی خط کی ایک دوسری صورت ہے جو کہ ہندوستان کے شمال مغرب میں چوتھی یا پانچویں صدی قبل مسیح سے لیکر پانچویں صدی عیسوی تک کم و بیش نو صد سال تک رائج رہا۔ اس رسم خط میں سامی حروف کی طرز پر داہنی جانب سے بائیں جانب کو لکھا جاتا ہے۔ جبکہ ہندوستان کے دوسرے رسم خط دائیں سے بائیں لکھے جاتے ہیں۔ سر جان مارشل اپنی کتاب ٹیکسلا میں لکھتے ہیں:۔

"اس میں شک نہیں کہ ایک حد تک ٹیکسلا اور شمال مغرب کے باشندوں نے نہ صرف آرامی رسم خط بلکہ آرامی زبان کو بھی استعمال کیا۔ چونکہ آرامی حروف پراکرت کی تمام قسم کی آوازوں کی ادائیگی سے قاصر تھے اس لئے آرامی رسم خط میں بہت سی ترمیمیں اور اضافے روا رکھے گئے۔ اس عمل نے ایک نئے رسم الخط خروشتی کو جنم دیا جو کہ پہلی دفعہ شہنشاہ اشوک (۲۰۰ سال قبل مسیح) کے زمانہ میں شمال مغربی صوبہ میں استعمال ہوا اور ٹیکسلا میں اس کا استعمال پانچویں صدی عیسوی تک ہوتا رہا۔

(ٹیکسلا جلد اول صفحہ ۱۵)

خروشتی رسم خط نہ صرف شمال مغربی سرحدی صوبہ میں رائج تھا۔ بلکہ اس کے کتبے افغانستان، ترکستان اور تبت سے بھی ملے ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسم الخط شمال مغربی صوبہ اور افغانستان سے نکل کر قرب و جوار کے علاقہ میں بھی پھیلا۔[1]

خروشتی رسم الخط کتبوں کے علاوہ بڑی کثرت سے سکوں پر بھی ہمیں ملتا ہے۔ ہندی یونانی بادشاہوں کے زمانہ کے سکوں پر یونانی اور خروشتی حروف ضرب کئے جاتے تھے۔ اسی طرح

---

[1] راج ترنگنی انگریزی ترجمہ از پنجیت سیتا رام پنڈت صفحہ ۵۶ حاشیہ و صفحہ ۶۰۳

پالی سکوں پر بھی یہ رسم خط ہمیں نظر آتا ہے۔ کُشانوں کے زمانہ کے سکے جالندھر ڈویژن سے ملے ہیں جن پر خروشتی حروف لکھے ہوئے ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرقی پنجاب میں بھی خروشتی رسم الخط براہمی رسم خط کے ساتھ ساتھ رائج رہا۔[۱] اسی طرح آثار قدیمہ کی دوسری تحریرات خروشتی میں پائی جاتی ہیں اشوکا کے چودہ سنگی فرامین شمال مغربی سرحد کے قریب کے مقامات میں خروشتی حروف میں چٹانوں پر کندہ ہیں، جو کہ بہت مشہور ہیں۔ انہی آثار کے پیش نظر جرمن محقق بوہلر (Buhler) نے ۱۸۹۵ء میں یہ نظریہ پیش کیا کہ جس علاقہ میں آرامی رسم خط کے آثار بکثرت ملتے ہیں (یعنی شمال مغربی پنجاب) اس میں آرامی زبان بھی کسی زمانہ میں اپنی اصلی اور حقیقی شکل میں بولی جاتی تھی۔ بوہلر کے نزدیک یہ زبان گندھارا یعنی شمال مغربی پنجاب میں بولی جاتی تھی۔ بیس سال بعد بوہلر کے اس نظریہ کی صداقت پر مستقل آثار قدیمہ نے مہر تصدیق ثبت کر دی۔

سر جان مارشل متحدہ ہندوستان میں آثار قدیمہ کے ڈائریکٹر جنرل تھے ٹیکسلا کی کھدائیوں میں ان کو بمقام سرکپ سے مرمر کا وہ کتبہ ملا جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے کہ آرامی زبان اور رسم خط میں یہ کتبہ تحریر کیا گیا۔[۲] اور سامی حروف کی طرز پر اس کتبہ کی عبارت دائیں سے بائیں چلتی ہے۔ اس کتبہ کا فوٹو صاحب موصوف کی کتاب "ٹیکسلا" میں شائع کیا گیا ہے۔ اس کتبہ کے ملنے کے بعد محققین کو یقین ہو گیا کہ شمال مغربی علاقہ میں آرامی زبان اپنی اصلی اور حقیقی شکل میں بولی اور لکھی جاتی تھی۔ کیمبرج ہسٹری آف انڈیا میں لکھا ہے کہ:۔

> "آرامی زبان گندھارا (یعنی شمال مغربی پنجاب) میں فارسی سے اپنی سادہ، اصلی اور حقیقی شکل میں منتقل ہوئی۔ یہ نظریہ ۱۸۹۵ء میں "بوہلر" جرمن محقق نے پیش کیا اور سر جان مارشل کو زمانہ حال میں جب ٹیکسلا کے آثار قدیمہ سے ایک آرامی کتبہ دستیاب ہوا تو انہوں نے اس نظریہ کو پایۂ ثبوت پہنچا دیا۔"
>
> (حصہ اوّل ایڈیشن ۱۹۳۵ء صفحہ ۶۲)

آرامی زبان کا ہندوستان میں پہلے اپنی اصلی اور حقیقی شکل میں پایا جانا اور بعد میں خروشتی کی صورت میں صدیوں تک اس کے رسم الخط کا محفوظ رہنا واضح ثبوت ہے اس امر کا کہ جب بنی اسرائیل شمال مغربی ہندوستان میں آئے تو ان کی زبان اور رسم خط جو کہ آرامی تھا ان علاقوں میں پھیل گیا (اس نظریہ کی غلطی مضمون کے آخر میں ثابت کی جائے گی کہ آرامی فارس سے ہندوستان میں منتقل ہوئی) شمال مغربی ہندوستان کے علاوہ یہودیوں کا ایک حصہ جنوبی ہندوستان میں اور مغربی ہندوستان کے ساحلی علاقوں میں بھی جا کر آباد ہوا۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ ان کی زبان بھی آرامی تھی۔ نیز یہ کہ اس حصہ ملک میں آرامی نہ صرف یہود کی زبان تھی۔ بلکہ مغربی ساحلی علاقہ کے لوگ بھی آرامی کو سمجھتے

---

[۱] قدیم تاریخ ہند از ونسنٹ اے سمتھ اردو صفحہ ۲۳ حاشیہ۔

[۲] یہ کتبہ آجکل کراچی کے نیشنل میوزیم میں رکھا ہوا ہے۔ ایف۔ سی۔ اندریاس اسے ایک حد تک پڑھنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ یہ کتبہ ایک اعلیٰ آفیسر کے اعزاز میں نصب کیا گیا تھا۔ جس میں ٹیکسلا کا نام اس کی وجہ تسمیہ کے لحاظ سے آرامی زبان میں "نجاررودا" آیا ہے جس کے معنی "نجاری" کے ہیں ٹیکسلا "تکشن سیلا" سے مرکب ہے جس کے معنی نجاری کا کام کے ہیں۔ (ٹیکسلا صفحہ ۱۶۵)

لگے تھے[۱]۔ قدیم عیسائی تاریخ کی شہادت موجود ہے کہ اس علاقہ میں آرامی انجیل بھی یہودی نسل کے عیسائیوں کے پاس موجود تھی۔ دوسری صدی عیسوی میں سکندریہ کے ایک عیسائی فلاسفر "پن ٹی نس" نے ہندوستان کا سفر کیا تو اس نے یہاں کے یہودی عیسائیوں کے پاس آرامی زبان میں انجیل کو پایا۔

۱۔ مشہور مؤرخ نینڈر (Neander) "چرچ ہسٹری" کے حصہ اوّل میں لکھتا ہے:۔

"عبرانی (آرامی[۲]) انجیل کا ذکر اس قیاس کا مؤید ہے کہ یہودی مسیحی بھی اس زمانہ میں مالابار کے ساحل پر آباد تھے۔ یوسیبس مؤرخ کا بیان ظاہر کرتا ہے کہ اس کے خیال میں جس ہندوستان میں "پن ٹی نس" گیا تھا وہ عرب سے دور فاصلہ پر واقع تھا۔ اور اس کا مطلب موجودہ ہندوستان سے تھا۔"

(نینڈر چرچ ہسٹری جلد اوّل صفحہ ۱۱۴)

۲۔ پادری برکت اللہ ایم اے اپنی کتاب تاریخ کلیسیائے ہندوستان کے حصہ اوّل میں لکھتے ہیں:۔

"ساحل مالابار پر اہل یہود کی ایک بستی تھی۔ ان میں روایت ہے کہ بادشاہ خورس کی غلامی سے بچنے کی خاطر ان کے آباؤ اجداد چھٹی صدی قبل مسیح جنوبی ہند بھاگ آئے تھے۔" (صفحہ ۹۵، ۹۶) "ان کی زبان آرامی تھی۔" (صفحہ ۱۰۲)

۳۔ سر ولیم ہنٹر جو کہ ایک ماہر مؤرخ ہند ہیں اپنی کتاب "The Indian Empire" میں لکھتے ہیں:۔

"رسولی زمانہ میں ساحل مالابار پر اہل یہود کی بستی تھی۔ دوسری صدی مسیحی میں عبرانی نسل کے مسیحی سوداگر اور دیگر اقوام کے مسیحی سوداگر تجارت کی خاطر مالابار میں بستے تھے۔" (دوسرا ایڈیشن صفحہ ۲۳۳، ۲۳۵)

۴۔ پی تھامس اپنی کتاب "Christians & Christianity in India & Pakistan" (عیسائی اور عیسائیت ہندوستان اور پاکستان میں) جو کہ حال ہی میں شائع ہوئی ہے میں لکھتے ہیں کہ حضرت مسیح ناصری کے حواری تومارسول پہلے پہل شمال مغربی ہندوستان میں آئے۔ یہاں افغانستان میں یہود کا ایک معتدبہ حصہ آباد تھا۔ جو کہ اپنے وطن سے جلاوطن ہونے کے بعد یہاں آکر بس گیا تھا۔ تومارسول اپنے ہم وطن قبائل میں مسیح کی آمد کی خوشخبری سنانے کے لئے مضطر تھے۔ اسلئے وہ اس حصۂ ملک میں سب سے پہلے وارد ہوئے۔ اسی طرح شمال مغربی سرحد کی اسرائیلی اقوام میں انہوں نے تبلیغ کی۔ چنانچہ وہ

"آج کے دن تک انڈو افغان بارڈر کے افغان قبائل اپنے آپ کو اسرائیل کی اولاد

---

[۱] The four Gospels by Charles Cutler Torrey P. 252

[۲] اس زمانہ میں آرامی عبرانی نام اختیار کر چکی تھی تفصیل پہلے حصہ میں گذر چکی ہے۔ مطلب ہے کہ یہ انجیل آرامی تھی۔

یقین کرتے ہیں۔"

مزید برآں توما رسول کو جب پتہ چلا کہ بنی اسرائیل کی ایک بڑی تعداد ہندوستان کے مغربی ساحلی علاقہ میں آباد ہے تو اس نے فیصلہ کیا کہ ساحلِ ملابار کی طرف بھی جانا چاہیئے۔ چنانچہ توما حواری جنوبی ہندوستان میں گئے وہیں شہید ہوئے۔ ان کا مقبرہ آج تک وہاں مرجعِ خلائق ہے۔ اسی طرح مصنف مذکور نے اپنی کتاب میں ثابت کیا ہے کہ مغربی ہندوستان میں حضرت مسیح کے حواری برتلمائی بھی آئے۔ اُن کے ذریعہ یہودی نسل کے لوگ عیسائی دین میں داخل ہوئے۔ یہ حواری آرامی انجیل کے مطابق بشارت دیتے تھے۔ (ص ۲۱، ۲۴)

پادری برکت اللہ صاحب ایم۔ اے اپنی کتاب تاریخ کلیسیائے ہندوستان کے حصہ دوم میں بہت سے تاریخی حوالوں سے ثابت کرتے ہیں کہ ہندوستان کے جنوب اور مغرب میں زمانۂ قدیم سے یہود آباد تھے۔ اُن کی مادری زبان آرامی تھی۔ اُن کے پاس جو انجیل تھی وہ بجائے یونانی کے آرامی میں تھی (ملاحظہ ہو پہلا باب) اسی طرح وہ ثابت کرتے ہیں کہ مشرق میں کلیسیائیوں نے آرامی زبان کو تادیر برقرار رکھا۔ (ص ۳۳)

اس تحقیق سے ظاہر ہے کہ ہندوستان میں بسنے والے بنی اسرائیل کی زبان آرامی تھی۔ آرامی کتبہ کا ملنا آرامی انجیل کا پایا جانا آرامی زبان اور رسم الخط کے آثارِ قدیمہ صاف ظاہر کر رہے ہیں کہ آرامی بولنے والی قومیں زمانۂ قدیم میں یہاں آباد تھیں۔ جس کے باعث ان علاقوں میں آرامی زبان کا دور دورہ ہوا۔

محققینِ یورپ کے نزدیک شمالی مغربی ہندوستان میں آرامی زبان اور اُس کے رسم الخط کی ترویج کا باعث ایرانی حکومت تھی۔ جس کی سرحدیں شہنشاہ دارا کے وقت میں دریائے سندھ تک پھیلی ہوئی تھیں (۵۲۲ سے ۴۸۶ قبل مسیح) چونکہ دارا کی حکومت بین المملکتی تعلقات کے لئے آرامی زبان اور اس کے رسم الخط کو استعمال کرتی تھی۔ اسلئے اس علاقہ میں آرامی زبان اور اس کا رسم الخط پھیل گیا۔

افسوس کہ محققینِ یورپ یہ سادہ نتیجہ اخذ نہ کر سکے کہ آرامی زبان کی ترویج کا باعث آرامی بولنے والے سامی قبائل تھے جو کہ اس علاقہ میں آباد ہوئے۔ یہ مسلّمہ ہے۔ کہ پانچویں صدی قبل مسیح میں ایرانی حکومت کی مرکزی زبان آرامی نہیں تھی بلکہ فارسیٔ قدیم اُن کی زبان تھی۔ دریائے فرات کے مغرب میں ایرانی حکومت کے جو صوبے تھے صرف اُن میں سرکاری زبان آرامی تھی۔ کیونکہ ان صوبوں میں آرامی بولنے والی قومیں آباد تھیں۔ ایرانی حکومت کے مشرقی صوبوں میں چونکہ عوام کی زبان آرامی نہیں تھی بلکہ ایران میں فارسیٔ قدیم اور دوسرے صوبوں میں دوسری مقامی زبانیں رائج تھیں اسلئے ان علاقوں میں صرف سرکاری خط و کتابت جو کہ بین الصوبائی سطح پر ہوتی تھی آرامی میں کی جاتی۔ باقی امور میں مقامی زبانیں اور رسم الخط بالکل آزاد تھے۔ لہٰذا یہ کوئی معقول وجہ نہیں کہ صرف افسران کے درمیان خط و کتابت

کے باعث ہندوستان کے شمال مغرب میں نہ صرف یہ کہ آرامی رسم الخط رائج ہوگیا بلکہ آرامی زبان بھی لوگ بولنے لگے یہاں تک کہ آرامی زبان کتبوں پر بھی لکھی جانے لگی۔ مقام غور ہے کہ خاص ایران میں اس زمانہ کے جو کتبات ملے ہیں وہ قدیم فارسی میں ہیں اور اُن کا رسم الخط آرامی نہیں بلکہ میخانی ہے۔ اسی طرح ایران میں آشوری یا میدیائی زبان کے کتبے ملے ہیں جن کا رسم الخط بھی میخانی ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ خاص ایران میں تو اس زمانہ میں کتبات قدیم فارسی آشوری یا میدیائی زبان اور میخانی رسم الخط میں ملتے ہیں لیکن ہندوستان کے شمال مغرب میں ایرانی حکومت کے افسران کی خط و کتابت اتنا طول کھینچتی ہے کہ یہاں کے لوگ مقامی زبان اور رسم الخط کی بجائے آرامی زبان اور رسم خط اختیار کر لیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک مضحکہ خیز نتیجہ ہے۔

تاریخ ادبیات ایران از ایڈورڈ براؤن اٹھا کر دیکھئے قدیم کتبات ایران ملاحظہ کیجئے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ ایران میں سب سے پہلا مشہور و معروف خاندان ہخامنشی تھا جس نے ۵۰۰ قبل مسیح سے ۳۰۰ قبل مسیح تک حکومت کی۔ سائرس دارا اور اس کے جانشین اسی خاندان کے فرد تھے۔ ان کی زبان فارسی قدیم تھی جو خطِ میخی (میخانی) میں لکھی جاتی تھی۔ اس دور کے کتبات میں احکامات و اعلاناتِ سلطانی اور فتوحات کے حالات کندہ ہیں۔ ان کی زبان بالعموم فارسی قدیم ہے اور رسم خط میخی یعنی میخانی۔ دوسری زبان اہل میدیا کے کتبوں پر نظر آتی ہے جو کہ فارسی قدیم سے ملتی جلتی ایک ایرانی زبان تھی۔ یا پھر آشوری زبان کے کتبات نظر آتے ہیں۔ آرامی اثر بہت بعد میں ظاہر ہوا۔ وہ بھی خالص آرامی کی صورت میں نہیں بلکہ پہلوی کی صورت میں رائج ہوا۔ بہرحال یہ مسلّم ہے ہخامنشی خاندان اور اس کے کتبات کی سرکاری زبان قدیم فارسی تھی۔ یہ وہ زبان تھی جو کہ سائرس، دارا اور اُن کے جانشین بولتے تھے اور کتبوں میں استعمال میں لائی جاتی تھی۔ اب یہ عجیب بات ہے کہ اس خاندان کے بادشاہ دارا کے دار الحکومت اور دوسرے مرکزی علاقوں میں تو آرامی زبان کے کتبات نہ ملیں لیکن شمال مغربی ہندوستان میں جو کہ اس کا ایک دُور افتادہ صوبہ تھا خالص آرامی زبان اور رسم خط پر مشتمل کتبہ پایا جائے۔ پس محققین یورپ کا یہ نظریہ تاریخی لحاظ سے بالکل غلط ہے کہ دارا کے زمانہ میں آرامی رسم الخط اور زبان ہندوستان کے شمال مغربی علاقہ میں پھیل گئی۔

ایک اور نقطۂ نظر سے بھی اگر دیکھا جائے تو یہ نظریہ غلط ثابت ہوتا ہے۔ شمال مغربی ہندوستان صرف ایرانیوں ہی کا نہیں بلکہ مختلف قوموں اور نسلوں کی آماجگاہ رہ چکا ہے لیکن آپ حیران ہوں گے کہ اس علاقہ میں غیر ملکی زبانیں رائج نہ ہوسکیں۔ اس کی وجہ یہ بھی کہ ہندوستانی باشندے بیرونی حملہ آوروں کو "ملیچھ" سمجھتے اور نفرت کے باعث اُن کی زبان اور رسم الخط اختیار نہ کرتے بلکہ صرف اپنی زبان کو عزیز تر رکھتے تھے۔ مقام غور ہے کہ ایرانی حکومت کی طرح یونانی النسل لوگوں کی حکومت بھی اس علاقہ پر کم و بیش دو سو سال تک رہی ہے۔

لیکن یونانی زبان اور اس کا رسم الخط یہاں رائج نہ ہوسکا۔ یونانی دورِ حکومت کے سکوں پر بھی علاوہ یونانی کے دیسی رسم الخط کے حروف ضرب کئے جاتے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عوام الناس یونانی سے بالکل ناآشنا تھے[1]۔ یونانی یہاں

---

[1] قدیم تاریخ ہند از سمتھ اردو صفحہ ۲۵۵ و صفحہ ۳۵٦ ۔

کم و بیش دو دو سو سال تک رہے یعنی ایک سو سال تک خود مختار حکمران بن کر اور ایک سو سال ماتحت حکمرانوں کی صورت میں۔ لیکن یونانی زبان کا ایک بھی کتبہ نہیں ملا سکوں پر ایک طرف یونانی اور دوسری طرف دیسی حروف ضرب کئے جاتے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے عوام میں یہ زبان پھیل نہیں سکی۔ یونانیوں کے بعد اس علاقہ پر سیتھین، پارتھین، کشان اور ہُن اقوام کا غلبہ و تسلط ہوا۔ یہ سب قومیں غیر زبانیں بولتے ہوئے ہندوستان میں داخل ہوئیں لیکن اپنی زبانیں یہاں پھیلا نہ سکیں۔ بحالیکہ سینکڑوں سال تک حکمران رہیں۔ اس تحقیق سے یہ تاریخی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ زمانۂ قدیم میں محض سیاسی دباؤ کی وجہ سے ہندوستان نے کوئی زبان قبول نہیں کی۔ (یہ الگ بات ہے کہ فارسی یا آرامی بولنے والی قوموں کے یہاں آباد ہونے کے باعث یہ زبانیں یہاں پھیل گئی ہوں)۔ ان حالات میں یہ کس طرح مان لیا جائے کہ آرامی بولنے والی آبادی کے بغیر محض ایرانی حکومت کی بین الصوبائی خط و کتابت کے باعث شمال مغربی پنجاب کے ایک حصہ میں آرامی زبان اور اس کا رسم الخط مقبول عام ہو گیا۔ تاریخی لحاظ سے جب ثابت ہے کہ بنی اسرائیل کے دس فرقے حملہ آور بن کر نہیں بلکہ اس دیس کے باسی بن کر یہاں آئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ ان کی زبان اور رسم خط آرامی تھا اور مذہبی لٹریچر بھی آرامی میں تھا۔ تو میں حیران ہوں کہ یہ سادہ نتیجہ اخذ کرنے میں کون سا امر مانع ہے کہ بنی اسرائیل کی کثیر آبادی کے باعث ان علاقوں میں آرامی زبان اور اس کے رسم خط کو پھیلنے پھولنے اور پھوٹنے کا موقع ملا اور آہستہ آہستہ باہمی تعلقات کی وجہ سے مقامی لوگوں نے بھی کسی حد تک آرامی زبان کو اپنایا اور اس زبان کے رسم الخط نے تو اس درجہ رواج پایا کہ وہ کم و بیش نو سو سال تک خروشتی کی شکل میں مستعمل رہا۔ شاید کسی کو خیال گزرے کہ موجودہ دیوناگری حروف کا ماخذ بھی رسم خط بھی باہر سے آمدہ ہے۔ یہاں یہ نوٹ رہے کہ یہ بھی رسم خط خود مغربی ہندوستان کے تاجروں کے ذریعہ عراق عرب سے یہاں آیا سیاسی دباؤ سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔

آخر میں یہ بتانا ضروری ہے کہ اگر گہری تحقیق کی جائے تو ثابت ہو جائیگا کہ قدیم ہندوستان کی بعض زبانوں میں خصوصاً کشمیری اور پشتو زبان میں آرامی عنصر پایا جاتا ہے ہمارے سلسلہ کے ایک بزرگ حضرت مفتی محمد صادق صاحب نے جو کہ عبرانی کے فاضل ہیں کشمیری زبان کو اس نقطۂ نظر سے جانچا ہے۔ ان کی کتاب "قبر مسیح" کے متعلق تحقیقات جدیدہ میں دی گئی جدولیں صاف ظاہر کرتی ہیں کہ کشمیری زبان میں عبرانی کے الفاظ بکثرت ملتے ہیں۔ آرامی اور عبرانی چونکہ بالکل مشابہ ہیں اسلئے صاف ظاہر ہے کہ کشمیری زبان میں عبرانی اور آرامی عنصر پایا جاتا ہے۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ خالص آرامی کو مدنظر رکھتے ہوئے کشمیری اور پشتو کا جائزہ لیا جائے۔ یہ کام بہت بڑی تحقیق کا محتاج ہے۔ ہماری جماعت کے پشتو اور کشمیری جاننے والے علماء کو اس علمی نظریہ کی طرف توجہ دینا چاہیئے ٭

شذرات

(۱) ہر نبوت را بروشد اختتام

اخبار "نوائے پاکستان" لاہور اب خالص احراری انقلاب میں آکر "نئے دَور کا آغاز کر رہا ہے - اسے "عقیدہ ختم نبوت کا پاسبان" ہونے کا دعویٰ ہے - ۳ر جولائی ۱۹۵۳ء کے پہلے پرچہ کے صفحۂ اوّل پر علامہ اقبال کے چند فارسی شعر شائع کئے گئے ہیں جن میں انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے ؎

اے کہ بد دلہا رموزِ عشق آساں کردہٗ

سینہ ہا را از تجلّی یوسفستاں کردہٗ

اے کہ صد طور ست پیدا از نشانِ پائے تو

خاکِ یثرب را تجلّی گاہِ عرفاں کردہٗ

اے کہ بعد از تو نبوت شد بہر مفہوم شرک

بزم را روشن ز نورِ شمعِ ایماں کردہٗ

غالباً مجاہد الحسینی صاحب نے آخری شعر کے پہلے مصرع کی وجہ سے اس نظم کا انتخاب کیا ہے - مگر اوّل تو جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مقامِ عالی یہ ہے کہ آپؐ نے بے شمار یوسف اور موسیٰ پیدا کر دیئے ہیں تو آپؐ کی اُمت میں ایک مسیح کے پیدا ہونے کو مستبعد خیال کرنا حیرت انگیز ہے - علامہ اقبال کی مراد "بعد از تو نبوت" سے یقیناً وہ نبوت ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں ہو اور آپؐ سے الگ ہو کر اس کا ادعا کیا جائے - ورنہ "صد طور" پیدا کرنے والے اور "یوسفستان" بنا دینے والے نبیِ اعظم کی روحانی توجہ کے فیوضِ عالیہ سے انکار کرنا کلام میں تضاد پیدا کر دے گا -

دوسرے یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ مسلمان حضرت مسیح کی آمدِ ثانی کے قائل ہیں اور انہیں نبی مانتے ہیں تو کیا یہ عقیدہ شرک ہے اور کیا علامہ اقبال کے قول کے مطابق تمام علماء مشرک قرار پائیں گے ؟

احمدیت کے عقیدہ کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیوض و برکات ہمیشہ جاری ہیں - اب تا قیامت ان ہی انوار کی بزم تاباں رہیگی اور ہر شخص اپنے اپنے ظرف کے مطابق اسی آفتاب حقیقت سے نور حاصل کرے گا - مہتاب آفتاب کے نور کا آئینہ ہوتا ہے شریک نہیں ہوتا - اُمتِ محمدیہ مسیح موعود کا یہی مقام مانتی ہے اور یہی عقیدہ جماعت احمدیہ کا ہے - ہم مانتے ہیں کہ کمالاتِ نبوت کا خاتمہ سید الاولین والآخرین حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم پر ہو چکا ہے - حضرت بانی سلسلہ احمدیہ فرماتے ہیں ؎

ہست او خیر الرسل خیر الانام

ہر نبوت را برو شد اختتام

(۲) احراری جماعت اسلامی کی نگاہ میں

مولانا مودودی صاحب کی جماعت کا ہفت روزہ المنیر لائل پور لکھتا ہے :-

" یہے احراری تو ہم اب اس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں کہ اس بدنصیب گروہ نے تحفظ ختم نبوت

کے نعرہ کو اپنے سیاسی کردار کی طرح بگاڑ و مال بنا رکھا ہے۔ ان لوگوں کی اکثریت کو نہ خدا کا خوف ہے نہ خلق کی شرم۔ نہ یہ پیغمبر کی نگاہِ خشمگیں سے ڈرتے ہیں اور نہ انہیں جلالِ کبریائی سے کوئی خطرہ محسوس ہوتا ہے ......

اور پھر احراری وہی حضرات ہیں جنہوں نے مارشل لاء کے دوران مخلص نوجوان مسلمانوں کو کرفیو اور دفعہ ۱۴۴ کی مخالفت پر اکسا کر مسجدوں سے سر پر کفن بندھوا کر باہر نکالا اور ان کی لاشوں کو فوج کی گولیوں تلے تڑپتا دیکھ کر یہ کہا کہ

"جس تحریک کو خون سے نہ سینچا جائے وہ تحریک کبھی "عوامی تحریک" بن ہی نہیں سکتی۔"

لیکن جب ان "علمبردارانِ حریت" کو چند ہفتے کے لئے جیلوں میں (جہاں انہیں بی کلاس میں تین چھٹانک گوشت، ایک چھٹانک گھی، چھ دودھ، چھ چھٹانک آٹا اور ہر تیسرے دن فروٹ کھانے کے لئے ملتے تھے) رہنا پڑا، تو ان کی اکثریت نے سینکڑوں مرتبہ زبانی اور دسیوں دفعہ تحریری طور پر لکھ دیا کہ

"ہم کبھی بھی حکومت کے خلاف نہ تھے نہ ہم نے سول نافرمانی کو آج تک جائز سمجھا ہے اور نہ آئندہ کبھی بھی اسے جائز سمجھیں گے۔ نیز یہ کہ ہم حکومت کے سچے وفادار ہیں اور ہم عہد کرتے ہیں کہ کسی سیاسی تحریک میں کبھی حصہ نہیں لیں گے۔"

آج یہ غازی ہیں جو ختم نبوت کا نعرہ لگا کر پھر میدانِ سیاست میں آنا چاہتے ہیں۔" (المنبر ۱۳ جولائی ۵۶ء)

(۳) تحریک ختم نبوت والوں کے ہتھیار

مدیر المنبر نہایت سنجیدگی سے لکھتے ہیں:-

"استہزاء، اشتعال انگیزی، یاوہ گوئی، بے سروپا الفاظ، اس مقدس نام کے ذریعہ مالی غبن، لادینی سیاست کے داؤ پیچ، خلوص سے محروم اظہارِ جذبات، مثبت اخلاقِ فاضلہ سے تہی کردار، ناخدا ترسی سے بھرپور مخالفت کسی بھی غلط تحریک کو ختم نہیں کر سکتی اور ملتِ اسلامیہ پاکستان کی ایک اہم محرومی یہ ہے کہ "مجلس احرار" اور "تحفظ ختم نبوت" کے نام سے جو کچھ کیا گیا ہے اس کا اکثر و بیشتر حصہ انہی عنوانات کی تفصیل ہے۔"

(المنبر لائل پور ۱۳ جولائی ۵۶ء)

سچ ہے گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے۔

وی پی آ رہے ہیں!

اس ماہ اُن خریداران کے نام پرچہ وی۔ پی کیا جا رہا ہے جن کے ذمہ الفرقان کا چندہ بقایا ہے۔ لہذا جن اصحاب کے پاس وی پی پہنچیں وہ براہِ کرم وصول کر لیں تاکہ ادارہ پر خواہ مخواہ بار نہ ہو۔ (مینجر)

امن کی بُنیاد

(محترم پروفیسر قاضی محمد اسلم صاحب صدر شعبۂ سائیکالوجی کراچی یونیورسٹی)

(۲)

[محترم پروفیسر قاضی محمد اسلم صاحب صدر شعبۂ سائیکالوجی کراچی یونیورسٹی نے تیسری پاکستان فلاسافیکل کانگریس (جو ۱۰ اپریل سے ۱۲ اپریل ۱۹۵۶ء تک پشاور میں منعقد ہوئی تھی) کا جنرل پریذیڈنٹ منتخب ہونے پر انگریزی زبان میں امن کے اہم ترین موضوع پر ایک فاضلانہ خطبہ ارشاد فرمایا تھا جس میں آپ نے قیام امن سے متعلق اسلام کی بینظیر تعلیم اور موجودہ زمانہ میں اس کی خاص اہمیت پر نہایت احسن پیرائے میں روشنی ڈالی تھی ماسبق خطبہ کے پہلے حصہ کا ترجمہ الفرقان کی گزشتہ اشاعت میں ہدیۂ ناظرین کیا گیا تھا۔ ذیل میں خطبہ کا باقی حصہ شریک اشاعت کیا جا رہا ہے۔ (ایڈیٹر)]

اب میں اسلام کے پیش کردہ منصوبۂ امن کے بعض پہلوؤں پر روشنی ڈالوں گا لیکن میرے ایسا کرنے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اسلام اور اسلامی موضوعات پر اظہار خیال کرنا پاکستان کے اسلامی مملکت ہونے کی وجہ سے ضروری ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ امن کے موضوع سے اسلام کو ایک خاص تعلق ہے۔ نیز میرے ایسا کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اسلام کے اس پہلو کو یا تو آج تک پوری طرح سمجھا نہیں گیا ہے یا لوگوں کے ذہن میں اس کے متعلق ایک غلط تصور قائم چلا آ رہا ہے۔

حال ہی میں "انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس" میں جنگ سے متعلق ایک مضمون نگار کا لکھا ہوا مقالہ میری نظر سے گزرا۔ اس میں امن کے متعدد منصوبوں کے متعلق اور علی الخصوص اُن منصوبوں کے ضمن میں جو مختلف مذاہب کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں بہت سی کام کی باتیں درج تھیں لیکن اسلام کا ذکر کرتے ہوئے وہی مضمون نگار لکھتا ہے۔

"تمام بڑے بڑے مذاہب میں سے اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو جنگ وجدال سے متعلق مشرق کی ظالمانہ روایات کا حامی ہے"

عام یورپی ذہن میں کئی نسلوں کی معاندانہ تحریرات کی بدولت اسلام کا جو تصور قائم چلا آ رہا ہے وہ بہت بھیانک ہے۔ اس کی بجائے ایک ایسا تصور ذہن نشین کرانے میں کہ جو حقیقی اسلام کے قریب تر ہو بہت لمبا عرصہ لگے گا۔ تاہم اس تبدیلی کے آثار ابھی سے نمایاں ہیں۔ حالات سے اس امر کی نشاندہی ہوتی ہے کہ وہ لوگ جن کے ذہنوں میں اسلام کا سرتا سر غلط تصور قائم چلا آ رہا تھا اب اس بات پر آمادہ ہوتے جا رہے ہیں کہ وہ ایک نئے تصور کا خیر مقدم کریں۔ جیسا کہ "ریڈرز ڈائجسٹ" میں جیمز اے مچنر کے مقالے "Islam - The mis understood Religion" سے ظاہر ہے۔

الغرض اسلام کے متعلق پھیلی ہوئی غلط فہمیوں اور اس خاص تعلق کی بنا پر جو اسلام کو امن کے موضوع سے ہے میں اختصار کے ساتھ اسلام کے منصوبۂ امن کے متعلق کچھ کہنا ضروری

سمجھتا ہوں۔ اس ضمن میں سب سے زیادہ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اس منصوبے کو دنیا میں پیش کرنے والے یعنی پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو آغازِ کار ہی ایک مہیب کشمکش اور لڑائی سے دوچار ہونا پڑا جس میں آپ کو ایسے ایسے شدید مظالم کے خلاف کہ جن کی تاریخِ انسانیت میں مثال نہیں ملتی، آزادیٔ ضمیر اور آزادیٔ مذہب کے دفاع کا فرض ادا کرنا تھا۔ ان لڑائیوں میں آپ کی چھوٹی سی جماعت بڑے بڑے شدید حملوں کو پسپا کرنے میں کامیاب رہی۔ اور پھر یہ حملے ان لوگوں کی طرف سے کئے جاتے تھے کہ جو تعداد اور سامانِ جنگ کے لحاظ سے کئی گنا زیادہ طاقت کے مالک تھے بعض اوقات مسلمانوں کے مقابلے میں ان کی تعداد اور ان کا سامان جنگ کئی گنا زیادہ ہوتا تھا۔ ابتدائی لڑائیوں کے بعد آپ پر جلد ہی یہ حقیقت منکشف ہو گئی کہ حملوں کا یہ سلسلہ بآسانی رکنے والا نہیں ہے بلکہ یہ پوری قوت کے ساتھ جاری رہے گا۔ ان حالات میں حملوں کے اس سلسلہ کو کس طرح ختم کیا جاسکتا تھا اور کس طریق پر عمل پیرا ہونے سے قیامِ امن کی ضمانت مل سکتی تھی؟ کیا اس طرح کہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لئے جو راستہ مقرر کیا تھا آپ اس پر ایمان رکھنے اور اس کو دوسروں تک پہنچانے سے باز آجاتے؟۔ نہیں۔ کیا پھر اس طرح کہ ایک تیسری پارٹی اٹھتی جو اتنی طاقتور اور سمجھدار ہوتی کہ وہ بیچ بچاؤ اور اثر سے کام لیکر عارضی طور پر ان کے درمیان صلح کرا دیتی اور دونوں متحارب جماعتیں بعد میں پائیدار امن کے حصول کے لئے کوشاں رہتیں یا اس وقت کا انتظار کرتیں کہ جب حالات سے مجبور ہو کر ان کے لئے باہم امن سے رہنا ممکن ہو جاتا؟ نہیں اس طرح بھی نہیں۔ نفسیاتی طور پر اسلام کو آغازِ کار میں صورتِ حال سے دوچار ہونا پڑا وہ اس پریشان کن صورتِ حال کے عین مشابہ تھی کہ جس سے زمانۂ حال کے باہم دو مخالف بلاکوں نے امن کے امکانات کو دوچار کر رکھا ہے۔ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے امن کو اپنا مطمحِ نظر بنایا، اس کے لئے جدوجہد کی اور بالآخر آپ اس کے حصول میں کامیاب رہے۔ ان حالات میں جو زمانۂ موجودہ کے حالات سے بہت مناسبت رکھتے ہیں آپ کو جو تجربات حاصل ہوئے اور آپ نے ان میں جو اسوہ پیش فرمایا وہ اس قابل ہے کہ اس سے رہنمائی حاصل کی جائے۔

اِس ضمن میں اسلام کے ابتدائی ایام سے تعلق رکھنے والے بعض اور حقائق بھی قابلِ توجہ ہیں۔ اسلام نے اپنے زمانۂ آغاز ہی سے معاہدات اور سمجھوتے کرنے اور انہیں ضبطِ تحریر میں لانے کے رواج کو ترقی دی۔ پھر معاہدات کرنے کے بعد ان کے احترام کو لازم گردانا، نیز اس نے مختلف علاقوں میں سفارتی نمائندے بھجوانے کا طریق رائج کیا۔ پھر یہ اسلام ہی تھا کہ جس نے ابتداءً وہ قواعد مرتب کئے جو آج بین الاقوامی قانون کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ اطالوی اور ہسپانوی قانون دان جنہیں یورپ میں بین الاقوامی قانون کا موجد و موسس گردانا جاتا ہے اسلام کے زمانۂ عروج کے بعد ہی میدان میں آئے۔ وہ ان ضوابط کے ہی خوشہ چین تھے جو اسلامی دنیا کے مشرقی اور مغربی مراکز میں پہلے ہی مرتب کئے جاچکے تھے حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے ابتداء ہی سے تمام معاملات میں انسانیت کے عالمی نقطۂ نگاہ پر زور دیا اور اس امر کی تعلیم دی کہ انسانیت سے تعلق رکھنے والے تمام معاملات میں عالمی نقطۂ نگاہ سے کام لیا جائے۔ یہ حقیقت خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبہ حجۃ الوداع کے مختلف اقتباسات سے بھی عیاں ہے جو

غور کیجئے "ایک انسان" ہاں بہت بڑا انسان محض قومی یا نسلی لیڈر نہیں بلکہ پوری انسانیت کا قائد اپنے انسان ساتھیوں سے مخاطب ہے اور وہ آخری وصیت کے طور پر ان سے خطاب کر رہا :۔

" اے لوگو! جو کچھ میں کہتا ہوں اسے
توجہ اور غور سے سنو۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ میں
اس کے بعد پھر اسی وادی میں تمہارے سامنے
کھڑے ہو کر تم سے اسی طرح مخاطب ہو سکونگا
جس طرح میں اس وقت تم سے مخاطب ہوں
تمہاری جانوں اور تمہارے مالوں کو اللہ تعالیٰ
نے قیامت کے دن تک ایک دوسرے کے
حملوں سے محفوظ کر دیا ہے۔
خدا نے میراث میں ہر وارث کا حق
مقرر کیا ہے۔ کوئی وصیت نہیں ہو سکتی جو
ایک جائز وارث کے مفاد کے خلاف ہو۔
ایک بچہ جو کسی گھر میں پیدا ہوتا ہے وہ اس
گھر میں اپنے باپ کی طرف ہی منسوب ہوگا۔

......

اے لوگو! بیویوں کے تم پر حقوق ہیں۔
اور تمہارے ان پر حقوق ہیں۔
اے لوگو! جو کچھ میں تمہیں کہتا ہوں اسے
غور سے سنو اور خوب یاد رکھو۔ تمام مسلمان
آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ تم سب برابر ہو۔
تمام لوگ خواہ وہ کسی بھی قوم یا قبیلے سے
تعلق رکھتے ہوں اور کسی بھی درجہ کے مالک
ہوں سب آپس میں برابر ہیں۔"

اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے اور ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں سے ملاتے ہوئے فرمایا :۔

" جس طرح دونوں ہاتھوں کی انگلیاں
ایک دوسرے کے برابر ہیں اسی طرح تمام
بنی نوع انسان آپس میں برابر ہیں۔ کوئی
شخص بھی دوسرے پر کسی امتیازی حق یا بڑائی
کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ یاد رکھو تم سب بھائیوں
کی طرح ہو۔"

خطاب جاری رکھتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

" کیا تم جانتے ہو کہ یہ کونسا مہینہ ہے ؟
اور یہ کونسی سرزمین ہے جس میں کہ ہم اس وقت
ہیں اور آج سال کا کونسا دن ہے ؟ "

مسلمانوں نے جواب میں عرض کیا کہ یہ مبارک مہینہ ہے، مبارک سرزمین اور حج کا مبارک دن ہے۔

اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

" جس طرح یہ مہینہ، یہ سرزمین اور یہ
دن تمہارے لئے قابلِ احترام ہے بالکل اسی
طرح خدا نے تم میں سے ہر شخص کی جان،
مال اور عزت کو حرام قرار دیا ہے۔ کسی
آدمی کی جان یا مال لینا یا اس کی عزت پر حملہ
کرنا ایسا ہی ظلم اور ایسی ہی معصیت ہے
جیسا کہ اس دن، اس مہینے اور اس سرزمین
کی حرمت کو توڑنا۔ جو کچھ حکم میں آج تمہیں

دیتا ہوں اسے صرف آج کے دن کیلئے ہی
نہ سمجھو بلکہ وہ ہمیشہ کے لئے ہے اس کو یاد
رکھو اور اس پر عمل کرتے چلے جاؤ یہاں تک
کہ تم اس جہان کو چھوڑ کر خالق حقیقی سے ملنے
کے لئے دوسرے جہان کی طرف کوچ کرو۔"

اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ عرب کی الگ تھلگ اور گمنام سرزمین میں انسانیت کے اس عظیم پیغامبر نے انسانی تعلقات کا تصور قائم کرتے وقت اس وسعت و دقتِ نظر سے کام لیا کہ جس کا وسیع ترین انسانی مفاد متقاضی تھا۔ نیز آپؐ نے قیام امن سے متعلق اور بہت سی باتوں کی بھی تعلیم دی۔

ظلم اور ناانصافی کا مقابلہ کرنے کے لئے آپؐ نے ایک ایسا طریق کار اختیار فرمایا جو سرگرمی، معقولیت اور عدل کا آئینہ دار تھا۔ ابھی آپؐ جوان ہی تھے کہ آپؐ نے لوگوں کے ایک ایسے حلقہ میں شمولیت اختیار فرمائی جس نے یہ عہد کیا تھا کہ وہ ہر حال میں مظلوم کی حمایت کریں گے۔ یہ عہد حلف الفضول کے نام سے موسوم تھا۔ اس گروپ میں شامل ہونے والے اس راہ میں پیش آنے والی الجھنوں سے تنگ آکر ایک ایک کر کے الگ ہوتے گئے اور اپنا عہد یکسر فراموش کر بیٹھے۔ ان میں سے صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی تھے کہ جنہوں نے اس عہد کو کبھی فراموش نہ ہونے دیا اور اس پر پوری استقامت کے ساتھ آخر دم تک قائم رہے۔ کئی سال بعد جب توحید باری اور توحید انسانیت کا درس دینے کے باعث آپؐ کے اور آپؐ کی چھوٹی سی جماعت کے خلاف شدید قسم کی تو بھی مخالفت بھڑک چکی تھی اور کفار مکہ نے آپؐ کو تنگ کرنے اور مشکل میں پھنسانے کی ایک تجویز سوچی۔ انہوں نے ایک غریب آدمی کو سکھا پڑھا کر آپؐ کے پاس استمداد کے لئے بھیجا۔ اس شخص نے ابوجہل سے کچھ رقم لینی تھی اور وہ یہ رقم دینے سے عمداً گریز کر رہا تھا۔ یہ آدمی آپؐ کے پاس آیا۔ سارا شہر اس انتظار میں تھا کہ آپؐ حلف الفضول کے تحت اس کی حمایت میں کوئی قدم اٹھاتے ہیں یا نہیں۔ اور اگر اٹھاتے ہیں تو اس کا کیا نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ اس معاملے میں ایک شدید قسم کی الجھن پیدا ہونے کا امکان تھا۔ اس وقت کے مخصوص حالات میں طبعی طور پر جو سوال پیدا ہوتا تھا وہ یہ تھا۔ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس مشکل اور پیچیدہ ذمہ داری سے بچنے کی کوشش نہ کریں گے؟ اور اس بناء پر عہد سے پھر نہ جائیں گے کہ تمام دوسرے لوگ اپنے اس عہد کو بالکل بھلا چکے ہیں؟ کیا ایسا کرنے سے لوگوں کو آپؐ پر ہنسنے اور تمسخر و استہزا سے کام لینے کا موقع نہ ملے گا؟ کیا برخلاف اس کے آپؐ جرأت سے کام لیکر ابوجہل کے پاس جائیں گے اور اس سے اس رقم کا مطالبہ کریں گے؟ کیا ایسی صورت میں ابوجہل کی متوقع درشت کلامی کے باعث آپؐ کو ایک ناخوشگوار صورت حال سے دوچار نہ ہونا پڑے گا؟ ہر حالت میں اہل مکہ کے لئے تفنن کا سامان بہم پہنچنا لازمی تھا اور وہ اسی انتظار میں تھے کہ ان کو تمسخر و استہزاء کا موقع ملے۔ حالات کی نامساعدت کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک لحہ توقف کئے بغیر اس شخص کے ساتھ ہو لئے۔ ابوجہل کے مکان پر پہنچے۔ دستک دیکر اسے باہر بلایا۔ جب وہ دروازے پر آیا تو آپؐ نے اس سے دریافت کیا، کیا تمہارے ذمہ اس شخص کی کوئی رقم ہے جو تم نے ابھی تک ادا نہیں کی؟ ابوجہل نے

یکدم گھبرا کر کہا۔ "ہاں"۔ آپؐ نے فرمایا۔ پھر ادا کیوں نہیں کرتے؟ ابوجہل اندر گیا اور رقم لاکر اس شخص کے حوالے کر دی۔

اس واقعہ کا اثر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں اور آپؐ کے دشمنوں کے خلاف ظاہر ہوا۔ پھر یہی نہیں کہ اہلِ مکہ اپنے ارادوں میں کامیاب نہیں ہو سکے اور بات ختم ہو گئی بلکہ جہاں تک قیامِ امن کا تعلق ہے اس واقعہ میں دُنیا کے لئے ایک مستقل اور پائیدار سبق بھی مضمر ہے اور وہ یہ کہ دُنیا میں امن صرف عدل کے ذریعہ ہی قائم ہو سکتا ہے۔ عدل کا قیام ہر حال میں ضروری ہے خواہ اس کی وجہ سے کتنی ہی اُلجھن اور پریشانی کیوں نہ لاحق ہوتی ہو۔

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر فرمایا۔ ہر شخص ایک بھائی کی حیثیت رکھتا ہے اور ہر بھائی کی مدد کرنا لازم ہے خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ مظلوم کی مدد کرنا تو سمجھ میں آتا ہے لیکن ظالم کی مدد کیوں اور کس طرح کی جائے؟ اس کے جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ظلم سے اس کا ہاتھ روک کر۔

الغرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانی تعلقات کو انتہائی گری ہوئی حالت میں پایا اور آپؐ نے انہیں اس حال میں چھوڑا کہ انسانی تعلقات میں اس سے بڑھ کر استواری ممکن نہ تھی۔ جہاں تک امن کے مسئلہ کا تعلق ہے آپؐ کے تجربہ اور آپؐ کے اُسوۂ مبارک کو لازوال قسم کی اہمیت اور وقعت حاصل ہے۔ اس موقع پر اسلامی تعلیم کے چیدہ چیدہ اقتباسات پیش کرنا مناسب ہوگا لیکن میں قرآن مجید کی روشنی میں صرف بنیادی اور اہم نکات پیش کرنے پر ہی اکتفا کروں گا۔ فھو ھٰذا:۔

جارحیت منع ہے لیکن اپنا بچاؤ کرنا اور حسبِ ضرورت حملہ کا باقاعدہ مقابلہ کرنا منع نہیں ہے۔ (سورۃ ۲۲ — آیت ۴۰ تا ۴۲) ابتدائی زمانہ کے مسلمانوں کو جنہیں تشدّد اور جارحیت کے بل پر بے پناہ مظالم کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ اجازت دی گئی تھی کہ وہ ظالموں کو پسپا کرنے، عقیدے اور عبادت کی آزادی قائم کرنے اور مسجدوں مندروں گرجاؤں اور دیگر عبادت گاہوں کی حُرمت برقرار رکھنے کے لئے کہ جنہیں خدا کا نام کثرت سے لیا جاتا ہے۔ حملہ آوروں کا مقابلہ کریں۔ جارحیت کا مقابلہ کرنے کے ضمن میں یہ تھا وہ خدائی طریق جس پہ آسمانی ہدایت کے تحت مسلمانوں نے عمل کیا۔

مذکورہ بالا مقصد اور مفہوم کے تحت جنگ کی جو اجازت دی گئی ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ خدا کی خاطر ہو نفس یا غیظ و غضب اور انتقام کی خاطر نہیں۔ پھر یہ بھی ضروری ہے کہ جارحانہ حملے کا مقابلہ کرتے وقت بھی کسی قسم کی زیادتی نہ کی جائے اور اعتدال کی راہ کو نہ چھوڑا جائے۔ مسجد حرام کے قریب جنگ کرنے سے حج کرنے میں رکاوٹ پڑنے کا امکان تھا اسلئے مسجد حرام کے قریب جنگ کرنے سے منع کیا گیا ہے تاوقتیکہ دشمن عین اس جگہ پر ہی جارحانہ حملہ کر کے خود مسلمانوں کو بھی ایسا کرنے پر مجبور نہ کر دے۔ اگر جواب میں دشمن جنگ سے باز آجائے تو پھر مسلمانوں پر بھی فرض ہے کہ وہ جنگ فوراً بند کر دیں۔ جب مذہبی آزادی قائم ہو جائے اور دین اللہ کیلئے ہو جائے

تو پھر بھی لڑائی سے دستکش ہو جانا لازمی ہے۔ (سورۃ ۲۔ آیات ۱۹ تا ۲۴)

اگر جنگ کے دوران دشمن صلح کی طرف مائل ہو، تو مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ امن کی پیشکش قبول کرلیں۔ خواہ ایسا کرنے میں دھوکہ کا خطرہ لاحق ہو۔ ان کا فرض ہے کہ وہ بھروسہ اللہ پر ہی رکھیں۔ (سورۃ ۸۔ آیات ۶۲، ۶۳)

جنگ کرنے کی اُس وقت تک اجازت نہیں ہے جب تک کہ دوسری پارٹی پر جارحانہ روش اختیار کرنے کی نامعقولیت پوری طرح واضح نہ کر دی جائے۔ یہ لازمی قرار دیا گیا ہے کہ جنگ کرنے کی ذمہ داری اپنے اوپر کسی صورت نہ آئے۔ بلکہ اس کا بار ہمیشہ مدمقابل کے کندھوں پر ہو۔ (سورۃ ۴۔ آیت ۹۵)

معاہدات کو توڑنے کی ہرگز اجازت نہیں ہے۔

(سورۃ ۹۔ آیت ۴)

حملہ آور دشمن کو بھی اسلامی نقطۂ نظر کو سمجھنے اور اس کا مطالعہ کرنے کا پورا موقع بہم پہنچانا ضروری ہے۔

(سورۃ ۹۔ آیت ۶)

غلام بنانے کی اجازت نہیں۔ ہاں جنگی قیدی ہو سکتے ہیں۔ یعنی ایسے لوگ کہ جنہیں اپنے قبضے میں لیکر آزادی سے محروم کر دیا جائے۔ کیونکہ انہوں نے دوسروں کو آزادی سے محروم کرنے کی ٹھانی اور عملاً ظلم کی راہ اختیار کی لیکن ان کے متعلق بھی ہدایت ہے کہ وہ اس حد تک آزاد ضرور ہوں کہ وہ توبہ یا اصلاح یا کسی تاوان کے ذریعہ یا پھر ازراہ ترحم اپنی آزادی دوبارہ حاصل کر سکیں۔ ان قیدیوں یا ان غلاموں کو آزاد کرنے کے متعلق جو اسلام سے بھی پہلے زمانہ سے غلام چلے آرہے ہوں علیحدہ احکامات بیان کئے گئے ہیں۔ ان سب کے ساتھ اعلیٰ ترین انسانی سلوک روا رکھنا ضروری قرار دیا گیا ہے۔ ان کو یہ اجازت بھی دی گئی ہے کہ وہ کام کر کے اپنی روزی کمائیں اور معاوضہ ادا کر کے اپنی آزادی دوبارہ حاصل کر لیں۔ (سورۃ ۸۔ آیت ۶۸ و سورۃ ۴۷۔ آیت ۵ و سورۃ ۲۴۔ آیت ۳۴)

جنگ کے آداب اور دوران جنگ میں مسلمانوں کے طرز عمل کے متعلق تفصیلی احکامات الگ ہیں جو سراسر رحمدلی اور خدا ترسی پر مبنی ہیں۔ جہاں تک جنگ کے مقاصد اور اس کے اسباب کا تعلق ہے دوسروں کے املاک پر للچائی ہوئی نظر ڈالنا، دوسروں سے حسد کرنا، اپنی ثقافت یا گزشتہ تاریخ پر بے جا فخر کرنا اور جائز لڑائیوں میں بھی مقررہ حدود سے تجاوز کرنا ان سب باتوں کی سخت مذمت کی گئی ہے۔

(سورۃ ۲۔ آیت ۳۰ و سورۃ ۴۹۔ آیت ۱۲)

جماعتوں، گروہوں اور مختلف اقوام کے تمام معاملات کو جمہوری طریق پر حل کرنا ضروری ہے (سورۃ ۴۔ آیت ۵۹) اسلام جیسا کہ وہ زمانہ آغاز میں تھا سرتاسر جمہوریت پر مبنی ہے۔ عقیدے کے معاملے میں پوری پوری آزادی تسلیم کی گئی ہے۔ (سورۃ ۲۔ آیت ۲۵) مختلف افراد یا جماعتوں میں کفر اور ایمان ایک ساتھ زندہ رہ سکتے ہیں۔ لوگوں کو آزادی دی گئی ہے کہ وہ چاہیں تو ایمان لائیں، پھر کفر اختیار کریں پھر ایمان لے آئیں اور پھر کفر کی راہ میں بہہ جائیں۔ (سورۃ ۴۔ آیت ۱۳۸) محض ایمان نہ لانے یا منکر ہونے سے فی نفسہٖ انسان اس دنیا میں کسی قسم کی سزا کا مستلزم نہیں ٹھہرتا۔ مرتدین کے بارے میں حکم ہے کہ محض ارتداد

کی وجہ سے ان پر کوئی سختی نہ کی جائے۔ ہاں اگر وہ خود لڑائی اور قتل و خونریزی کی راہ اختیار کریں تو پھر دوسری بات ہے۔ (سورۃ ۴ - آیت ۹۱)

اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اسلامی شریعت میں قیام امن کے پیش نظر بین الاقوامی تنظیم کا ایک نہایت خوبصورت اور دلکش خاکہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ اتنا خوبصورت اور دلکش کہ جس کی کوئی اور نظیر پیش نہیں کی جا سکتی۔ سابقہ لیگ آف نیشنز اور موجودہ اقوام متحدہ کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ یہ بین الاقوامی تنظیمیں اسلام کے پیش کردہ بین الاقوامی نظام سے جزوی طور پر کسی حد تک تو مناسبت رکھتی ہیں لیکن امن کے بلند معیار پر پوری اترنے میں ابھی تک کامیاب نہیں ہو سکی ہیں بین الاقوامی تنظیم کا یہ خاکہ قرآن مجید کی سورۃ ۴۹ کی آیت۔ ۱۰ میں بیان کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے:-

اگر مومنوں میں سے دو جماعتیں باہم لڑ پڑیں تو ان کے درمیان صلح کرا دو۔ پھر اگر ان میں سے ایک جماعت دوسری جماعت پر زیادتی کرے تو اس کو زیادتی کرنے والی جماعت کے ساتھ لڑو۔ یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف رجوع کرے۔ پھر اگر وہ رجوع کرے تو ان کے درمیان عدل کے ساتھ صلح کرا دو۔ اور انصاف سے کام لو۔ بلاشبہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

حملے کے آغاز سے لے کر صلح ہونے تک جس طریق عمل پر کاربند ہونے کی تلقین کی گئی ہے وہ تمام کا تمام ایک بین الاقوامی قانون کے لب و لہجہ میں بیان کر دیا گیا ہے۔ اس کے اختتام پر جو ہدایات دی گئی ہیں وہ خاص طور پر اہم ہیں۔ یہ لازمی قرار دیا گیا ہے کہ لڑائی کو ابتدائی سبب تک ہی محدود رکھا جائے حتیٰ کہ ظالم اور حملہ آور کے ساتھ بھی اچھے اور منصفانہ سلوک کی تلقین کی گئی ہے۔ پھر یہ بھی ہدایت ہے کہ حملہ آور کے ساتھ صلح اس نوعیت کی نہ کی جائے۔ کہ جو بالآخر ایک اور جنگ کا پیش خیمہ ثابت ہو۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے موقع پر اس اصل کا نہایت شاندار مظاہرہ کیا۔ اہل مکہ نے حدیبیہ کے صلحنامہ کو توڑا تھا۔ اس بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جنگ کرنے کا پورا حق حاصل تھا۔ چنانچہ آپ نے مکہ پر چڑھائی کی اور خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر اسے فتح کر لیا۔ اس موقع پر اہل مکہ کو ذکر دامنگیر ہوا کہ انہیں اٹھارہ سال کی زیادتیوں اور مظالم کی نہ جانے کیا سزا بھگتنی پڑے گی۔ جب وہ سب ایک جگہ جمع ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے فرمایا "آج کے دن تم پر کوئی گرفت اور کوئی ملامت نہیں ہے"۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انتہائی مشکل اور مخالف حالات میں عزم اور ایمان کے بل پر امن قائم کرنے میں کامیابی حاصل کی اور پھر عفو و درگذر سے کام لے کر قائم کردہ امن کو پائیداری اور استواری سے ہمکنار فرمایا۔

دور جدید میں جب سامراجی اور نوآبادیاتی نظام کی بنیاد پڑی تو فلسفۂ اخلاق کے ماہروں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ حالانکہ اسی نوآبادیاتی نظام کی وجہ سے دنیا میں بہت سی جنگیں لڑی گئیں اور آج بہت سے زخم جن کا مندمل

ہوتا مشکل نظر آرہا ہے اسی کے مرہونِ منت ہیں۔ برخلاف اس کے مسلمانوں کو جب اللہ تعالیٰ نے فتح اور حکمران بنایا تو انہوں نے بڑی بڑی جاگیریں قائم نہیں کیں اور نہ دوسرے فاتحین کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے انہوں نے مفتوحہ علاقوں اور زمینوں کو فاتحین کے درمیان تقسیم کیا۔ انہوں نے مفتوحہ علاقوں کے انتظام میں وہاں کے مقامی قوانین اور نجی ضابطوں کو جگہ دی۔ اور اس معاملے میں لوگوں کو ان کے اپنے حال پر چھوڑے رکھا۔ چنانچہ شام اور عراق میں مسلمانوں کے اپنے قبضہ میں بڑی بڑی جاگیریں نہ تھیں۔ خود ہندوستان میں بھی مسلمانوں نے بڑی بڑی شاہانہ ریاستیں یا جاگیریں قائم نہیں کیں۔ یہ بہت بعد میں انگریزوں کے ہاتھوں معرضِ وجود میں آئیں۔

قیامِ امن کے ضمن میں اسلام نے لوگوں کی اقتصادی ترقی، اقتصادی انصاف اور اقتصادی امن کے قاعدے اور ضابطے بھی مقرر کئے ہیں جو اپنی ذات میں ایک علیحدہ مضمون کی حیثیت رکھتے ہیں۔

بہرحال ماضی میں جنگ کے نتیجے میں جو تجربات حاصل ہوئے ہیں اور دُنیا جس طرح تورات اور قرآن مجید کی پیشگوئیوں کے موجب دو عظیم طاقتور بلاکوں میں منقسم ہوگئی ہے وہ اس امر کی آئینہ دار ہے کہ جنگ سے بچاؤ کا راز انسان کی اخلاقی اور روحانی فطرت میں مضمر ہے۔ یہی وہ سبق ہے جو موجودہ زمانہ میں مخالف طاقتوں کے باہمی ٹکراؤ کے نتیجے میں رونما ہونے والے حالات سے ہم حاصل کر سکتے ہیں۔ سیاسی چالبازی، باہمی خوف اور حکمتِ عملی سے تعلق رکھنے والے مفادات جنگ کو ملتوی کر سکتے ہیں اور غیر معین عرصہ تک بھی اسے التوا میں ڈال سکتے ہیں۔ یہی نہیں ان کی وجہ سے ہلاکت آفرین ہتھیاروں کے محدود استعمال کے متعلق باہمی سمجھوتہ بھی ہو سکتا ہے لیکن یہ سب عارضی سہارے ہیں ان کی مدد سے بنیادی طور پر جنگ پر قابو پانا ناممکن ہے۔ جنگ پر قابو پانے کا خواب انسان انسان کے درمیان خیر سگالی اور محبت کے جذبہ کو فروغ دینے اور سب کی خوشحالی کو مطمحِ نظر بنانے کے سوا کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ یہ جب ہی ممکن ہوگا کہ جملہ مخلوقات میں بالعموم اور انسانی زندگی میں بالخصوص ایک بالاتر مقصدیت کی کارفرمائی کا احساس لوگوں کے ذہنوں میں اُجاگر ہو اور اسکو تسلیم کرنیکا شعور اس نہج پر پہنچ جائے کہ اس کے بالمقابل کمتر درجے کے مقاصد اتنے ہی فروتر نظر آنے لگیں جتنے کہ وہ ہیں۔ اس احساس اور شعور کو امن کے حق میں ایک بیش قیمت سرمایہ کی حیثیت حاصل ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ آیا بنی نوع انسان میں احساس و شعور کا یہ جوہر موجود ہے یا نہیں؟ سو اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بنی نوع انسان میں اس جوہر کی ہرگز کمی نہیں ہے۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ انسان میں کافی حد تک اس جوہر کی ارزانی پائی جاتی ہے۔ اس کا ثبوت ہمیں انسانی تاریخ اور انسانی فکر کے ارتقائی احوال میں مل سکتا ہے۔ بے شک ہم جنگوں سے بھی دوچار ہوتے رہے ہیں۔ لیکن امن کے دور بھی ہم پر گزرے ہیں۔ جنگ کے افکار کی فراوانی بے شک گل کھلاتی رہی ہے لیکن امن کے افکار سے بھی ہمیں حصہ وافر ملتا رہا ہے۔ بے شک ظالم اور جابر قسم کے لوگ ہم میں پیدا ہوتے رہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ایسے بندگانِ خدا بھی ہم میں پیدا ہوئے جنہوں نے کردار کی مضبوطی اور اخلاق کی بلندی سے ظلم کا مقابلہ کیا۔ اور پھر محبت اور رأفت کی مدد سے اس پر فتح حاصل کی۔

امن کے معاملے میں سوشل فلسفے جنہوں نے انسانی فطرت کو بے چارگی اور کم مائیگی کا مرقع اور بدی اور ظلم کا آئینہ دار قرار دیا ہے ہمارے کسی کام نہیں آسکے۔ ایسے فلسفوں کا مجموعی اثر ہمیشہ یہی رہا ہے کہ ان کی وجہ سے لوگوں کی مایوسی میں اضافہ ہوا اور امن کے معاملہ میں انسان کو جو وسائل اور ذرائع حاصل ہیں ان پر یقین اور اعتماد میں انحطاط کی کیفیت رونما ہوئی۔ ان فلسفوں کے زیر اثر امن کے بارے میں یہ فرض کرلیا گیا ہے کہ اس کا مدار خوف پر ہے یعنی ہر شخص دوسرے سے خائف ہے۔ ہر پڑوسی اپنے ساتھ والے پڑوسی سے ڈرتا ہے علیٰ ہذا القیاس کوئی ایک بھی نہیں جو دوسرے سے ڈرتا نہ ہو۔ اس فرضی خوف کو ہی امن کا ضامن تصور کیا جاتا رہا ہے اسی طرح بین الاقوامی امن جب کبھی اور جہاں کہیں بھی قائم ہوا اس کے متعلق بھی یہی نظریہ قائم کرلیا گیا کہ اس کا مدار بھی باہمی خوف پر ہے۔ اسی بنیاد پر اب عالمی امن کے متعلق بھی یہی سمجھا جانے لگا ہے کہ باہمی خوف کے سوا کسی اور ذریعہ سے اس کا قائم ہونا ممکن نہیں ہے۔ یعنی عالمی امن کے لئے ضروری ہے کہ کرۂ ارض کا ایک حصہ دوسرے سے ڈرتا اور خوف کھاتا رہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جونہی ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ ایک حصہ دوسرے حصے سے چنداں خائف نہ ہے تو پھر جنگ چھڑ جانی چاہیئے۔ کیونکہ موجودہ طاقتور بلاکوں کے سوا کوئی تیسرا بلاک ایسا نہیں ہے کہ جس سے خوف کھاکر جنگ سے باز رہا جاسکے۔ ہیڈلے کنٹرل (Hadlay Cantrill) پہلے ہی ثابت کرچکا ہے کہ مریخ پر سے کرۂ ارض پر حملے کا خطرہ ایک افواہ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔

وہ لوگ جن کے نزدیک زندگی اور خلق کا پیارا سلسلہ بغیر کسی عظیم مقصد کے معرضِ وجود میں آیا ہے اسی طرح وہ لوگ جو انسان کو بنیادی طور پر خود غرض تصور کرتے ہیں یا وہ لوگ جن کا نظریہ یہ ہے کہ اخلاقی عوامل راستی یا غلط روی پر اثر انداز نہیں ہوتے بلکہ صرف امید، خوف، خواہش اور نفرت وغیرہ پر ہی ان کا اثر ظاہر ہوتا ہے انہیں امن کے بارے میں پُرامید ہونے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اور اگر وہ پُرامید ہیں تو لازماً ماننا پڑے گا کہ ان کی پالیسی اور اُن کے فلسفیانہ نظریات میں تضاد ہے یعنی نظریات تو مایوسی کے آئینہ دار ہیں اور پالیسی میں اُمید کی جھلک نظر آتی ہے۔ ان حالات میں ہم اُن سے یہ درخواست کرنے میں حق بجانب ہوں گے کہ وہ کم از کم اپنے فلسفیانہ نظریہ کو بھی اتنا ہی بہتر بنانے کی کوشش کریں جتنی کہ اُن کی اپنی پالیسی اچھائی کی آئینہ دار ہے۔

وہ لوگ جن کا یہ ایمان ہے کہ انسانی زندگی ایک عظیم مقصد کی آئینہ دار ہے اور روئے زمین سے اس کا سلسلہ اس وقت تک نابود نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ مقصدِ عظیم بنیادی طور پر پورا نہ ہوجائے ان کو ہی یہ حق پہنچتا ہے اور وہی اس بات کے سزاوار ہیں کہ وہ انجام کے بارے میں پُرامید رہیں اور بجا طور پر یہ توقع رکھیں کہ خداداد صلاحیتوں اور ذہنی استعدادوں کی مدد سے آخرکار ایسی مضبوط بنیاد میسر آسکے گی کہ جس پر پائیدار امن کا قیام ممکن ہوسکے۔ ایسے لوگ یقین اور ایمان کی دولت سے مالا مال ہوکر (خواہ وہ مذہبی نوعیت کا یقین ہو یا کسی اور نوعیت کا) امن کے لئے ذہنی اور عملی جدوجہد جاری رکھ سکتے ہیں۔

یہاں اس امر کا ذکر بے جا نہ ہوگا کہ برٹ رینڈرسل

کے نزدیک مذہبی ایمان و ایقان بالکل بے معنی چیز ہے۔ ان کا نظریہ یہ ہے کہ مذہبی ایمان شہادت یا ثبوت سے معرا ہوتا ہے۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ ایسا ایمان جو شہادت یا ثبوت سے معرا ہو وہ ایمان نہیں بلکہ توہم پرستی کا دوسرا نام ہے۔ اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ بلاشبہ ایسا بودا ایمان زیادہ عرصہ قائم نہیں رہ سکتا۔ لیکن یہ کہ ہر مذہبی ایمان ثبوت کی تائید اپنے ساتھ نہیں رکھتا درست نہیں ہے۔ اس ضمن میں میرے نزدیک ارنسٹ جونز (Earnest Jones) کا ایک ریمارک نسبتاً زیادہ حقیقت پر مبنی ہے۔ ان سے ایک شخص نے دریافت کیا کہ کیا نفسیاتی تجزیہ کے نتیجے میں افراد کے مذہبی ایمان یا ان کے معتقدات کا ساقط ہونا لازمی ہے۔ ارنسٹ جونز نے اس کے جواب میں کہا "بشرطیکہ ان کا مذہبی ایمان شہادت یا ثبوت کی تائید سے معرا ہو" یعنی ایسا مذہبی ایمان جسے ثبوت اور تجربہ کی تائید حاصل ہو اس کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہو سکتا۔ یہ دوسری بات ہے کہ انسان اس بارے میں اپنے تجربہ کو دوسروں پر واضح کر سکے یا نہ کر سکے۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ دوسرے لوگ بھی اس تجربہ سے مطمئن ہو سکیں یا نہ ہو سکیں۔ مزید برآں یہ امر کہ مذہبی ایقان اپنے ساتھ ثبوت رکھتا ہے یا نہیں امن کے معاملے میں چنداں اہمیت نہیں رکھتا۔ کیونکہ امن کے حصول کے لئے کسی کے معتقدات کا مسلّم الثبوت ہونا شرط نہیں بلکہ افراد اور اقوام کے درمیان باہمی تعاون کا ہونا شرط ہے جو چیز ضروری ہے وہ یہ ہے کہ مختلف قومی گروپ اور اسی طرح مختلف نظریاتی گروپ باہم مل کر ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں تاکہ قیام امن کی کوئی صورت نکل سکے۔ اب اگر مسٹر برٹرینڈ رسل اس بات کے سختی سے قائل ہیں کہ مذہبی ایمان و ایقان ثبوت سے بالکل معرا ہوتا ہے تو کیا وہ از روئے عقل مذہبی ایمان رکھنے والوں کے ساتھ تعاون سے انکار نہیں کر سکتے۔ اور بالخصوص ایسی صورت میں کہ مذہبی ایمان رکھنے والے قیام امن کے بارے میں ان کے ساتھ تعاون کرنے کے لئے تیار ہوں۔ عدم تعاون کا کوئی جواز نکل ہی نہیں سکتا۔ اسی طرح کوئی مذہبی گروپ کسی غیر مذہبی گروپ کے ساتھ تعاون کرنے سے انکار نہیں کرے گا۔ اور مختلف مذہبی گروپ تو ایک ایسے مقصد کے حصول میں جو بنیادی طور پر ان سب کے نزدیک انتہائی اہمیت کا حامل ہو عدم تعاون کا خیال بھی دل میں نہیں لا سکتے۔

اس سے جس امر کی نشاندہی ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ امن کا موضوع ایک سائنسی علم کی حیثیت رکھتا ہے جس کو ترقی دینے کے لئے دنیا بھر میں تمام نظریاتی گروپوں کو باہم مل کر کام کرنا چاہیئے۔ باہم تعاون اور اشتراک عمل کی دعوت کوئی ایسی دعوت نہیں ہے کہ مختلف گروپوں کیلئے جس کو قبول کرنا دقت طلب ہو اور اگر بفرض محال یہ ہو بھی تو امن کے نام پر ہونے کے باعث کون ہوگا جو اسے قبول کرنے سے انکار کرے۔

مختلف نظریاتی گروپ خواہ وہ سائنسدان ہوں یا فلسفہ دان، مذہب سے تعلق رکھنے والے ہوں یا غیر مذہبی حیثیت کے حامل، جب تک امن کے مسئلہ کے ساتھ ان کی وابستگی قائم ہے اس وقت تک ان کے درمیان ربط اور تعاون کو بڑھانا اور انہیں باہم منظم کرنا از بس ضروری ہے اس طرح امن کی دائمی بنیادوں کو مستحکم بنانے میں بہت مدد ملے گی۔

ایسی تنظیم کے لئے جو سب گروپوں کو امن کے نام پر باہم مربوط کر سکے۔ بلاشبہ وہ تمام سہولتیں فراہم کرنا ہوں گی جو بالعموم ایک تنظیمی ڈھانچے کو کامیابی سے چلانے کے لئے ضروری ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر اس کے لئے ایک صدر مقام کی تجویز، آفس اور سیکرٹریٹ کا قیام، رہنما کمیٹی اور اس کے لئے نظریاتی گروپوں کے مستقل نمائندوں کا تقرر، حسب ضرورت جلد جلد یا وقفہ کے بعد اجتماعات کا انعقاد۔ ایجنڈوں، کارگذاریوں اور باقاعدہ یا خصوصی مطبوعات کی اشاعت کا اہتمام وغیرہ وغیرہ۔ جب یہ تنظیم معرض وجود میں آجائے گی تو نئے نئے نظریاتی گروپوں کی طرف سے رکنیت کی درخواستیں موصول ہونے پر ان کے استحقاق کو جانچنے اور اس کے متعلق فیصلے کرنے ہوں گے۔ مختلف زبانوں کی ایک ایسی لائبریری کا قیام بھی عمل میں لانا ہوگا کہ جس میں وہ علمی ماخذ اور وسائل فراہم ہو سکیں کہ جن پر مختلف ممبر گروپ انحصار رکھتے ہوں۔

اس تنظیم کا سب سے اہم کام یہ ہوگا کہ ان مسائل اور سوالات کو معین شکل دی جائے کہ جن کو حل کرنا امن کے مفاد کے پیش نظر ضروری ہے۔ سوالات کو معین شکل دینے کے بعد یہ تنظیم ممبر گروپوں سے ان کے جوابات حاصل کرکے انکو پھیلوانے کا انتظام کریگی۔ یہی نہیں پھر ہر ممبر گروپ کیلئے یہ موقع فراہم کرنا ہوگا کہ وہ دوسرے گروپوں کے جوابات پر تبصرہ کر سکے اور خود اپنے جوابات پر دوسرے ممبر گروپوں کے تبصروں کا مزید جواب دے سکے۔ اس طرح ابتدائی مسائل کی پہچان بین کرنے سے بعض اور اہم مسائل پیدا ہوں گے۔ ان کے متعلق بھی وہی طریق کار اختیار کرنا ہوگا جو ابتدائی مسائل کو حل کرنے کے لئے اختیار کیا گیا۔ اور جس کے نتیجے میں یہ نئے مسائل پیدا ہوئے۔ اس طرح ہو سکتا ہے کہ مسائل میں سے نئے نئے مسائل کی شاخیں پھوٹنے کا سلسلہ چلتا چلا جائے لیکن یہ سلسلہ غیر محدود نہیں ہوگا۔ اس تنظیم کو اس نہج اور اسلوب پر کام کرنے کی اجازت نہ ہوگی جو ماضی میں خشک منطق اور ناقابل عمل فلسفہ کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ اس لایعنی اسلوب میں سوالات میں سے سوالات پیدا ہونے کے سلسلہ کو اس حد تک طول دیا جاتا ہے کہ یہ ختم ہونے میں ہی نہیں آتا اور ایک لامتناہی سلسلہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے حتیٰ کہ زیر بحث مسائل کی ابتداء اور ان کی انتہا میں کوئی قدر مشترک باقی نہیں رہتی۔ یہ تنظیم بہرحال اپنے مقصد کو واضح طور پر مدنظر رکھے گی اور وہ مقصد امن کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔ سوالات کے استخراج اور اس کے سلسلہ کو لازمی طور پر مخصوص نکات پر چلانا ہوگا۔ اور اس تعاون کے نتیجے میں جو خیالات اور نظریے معین صورت میں ابھر کر سامنے آئیں گے انکی زیادہ سے زیادہ اشاعت کرنا ہوگی۔ اور اس غرض کے تحت ضروری قواعد مرتب کرنا ہوں گے۔ ہر گروپ اپنے اثر و نفوذ، اپنی وسعت اور جغرافیائی تقسیم کے متعلق مفصل معلومات بہم پہنچائے گا۔ اور اس منظم تعاون کے نتیجے میں جو خیالات رونما ہوں گے ان کو اپنے حلقۂ اثر اور ماننے والوں میں پھیلانے اور ان کی اشاعت کرنے کا ذمہ دار ہوگا۔ بعض مسائل سے ایسے سوالات مستنبط ہونے پر کہ جو مخصوص حقائق پر مبنی ہوں اور ان سوالات کی تحقیقات دنیا کے کسی حصہ کے حالات کے مشاہدے اور معائنہ کی متقاضی ہو ممبر گروپوں کا فرض ہوگا کہ وہ ان حالات کے مشاہدے اور معائنہ کو ممکن بنائے اور اس کا انتظام کرنے میں تمام ذرائع اور وسائل کو کام میں لائیں۔

یہ تنظیم تحقیقات کے نئے نئے حلقے اور نئے نئے میدان بھی متعین کرے گی۔

اگر مبنی بر حقائق سوالات کا تعلق تاریخ سے ہو یا کسی متن کے معنی اور مفہوم سے ہو تو ایسے سوالات کو حل کرنے کے لئے ماہرین کے کمیشن مقرر کرنے ہوں گے۔

ممبر گروپوں کو اس بات کی اجازت ہوگی کہ وہ اپنے اپنے گروپوں کے متعلق دوسرے گروپوں اور ان کے ماننے والوں میں جو نظریات پھیلے ہوئے ہوں وہ ان کے مطالعہ اور ان کی جانچ پڑتال کے لئے سہولتیں فراہم کرنے کا مطالبہ کریں۔ دراصل یہ تنظیم کے سیکرٹریٹ کا فرض ہوگا کہ وہ ممبر گروپوں کی سہولت کیلئے ایسے نظریات کو جمع کرے اور ممبران سے کوئی ایسا طریقہ کار متعین کرنے کے لئے کہے کہ جس کی مدد سے ان نظریات کو پرکھا اور ان کے متعلق آزادانہ طریق پر کسی فیصلے پر پہنچنا ممکن ہو سکے۔

طے شدہ اصولوں اور معیار کے مطابق وقتاً فوقتاً جن مسودات کے بارے میں اتفاق ہو جائے گا (بجز بعض خصوصی معاملات کے ضروری نہیں کہ یہ اتفاق ممبران کی سو فیصدی آراء پر مشتمل ہو) یہ مسودات افادۂ عام کی غرض سے شائع کئے جائیں گے۔

ابتداء میں اچھا خاصا وقت مختلف گروپوں کے نظریاتی ماخذ متعین کرنے اور ان کی فہرستیں مرتب کرنے پر صرف کرنا ہوگا۔ نظریاتی بحثوں میں بالعموم بہت سا وقت اور محنت محض اسلئے ضائع ہو جاتی ہے کہ فریقین ایک دوسرے کی مستند کتب یا صحیح ماخذوں کے حوالے نہیں دیتے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ غلطی سے یا لاعلمی کی بنا پر یا پھر تعصب کی وجہ سے غلط یا دوسرے درجے کے ماخذوں پر حصر کر کے ایک دوسرے کی تردید پر زور دیا جاتا ہے۔ ہر گروپ کو یہ حق ہوگا کہ وہ اپنے ماخذوں اور مسلمہ کتب کی فہرست خود پیش کرے۔ اس کے بعد تراجم کا سوال پیدا ہوگا۔ اگر مروجہ تراجم میں سے بعض تراجم کسی گروپ کے نزدیک قابلِ قبول ہوئے تو ان کی نشاندہی اور تعیین کر دی جائے گی۔ ورنہ نئے تراجم کئے جائیں گے اور ان کے لئے طریق کار اور معیار کی تصریح کی جائے گی۔ ظاہر ہے کہ اس ضمن میں ہر ممبر گروپ ان مستند اور مسلمہ کتب کے تراجم کا ذمہ دار ہوگا کہ جو اس سے متعلق ہوں گی۔

اس خیالی تنظیم سے تعلق رکھنے والے بعض امور اور بھی ہیں جن کا تصفیہ کرنا ہوگا۔ مثال کے طور پر اخراجات کو پورا کرنے کے لئے مالی وسائل کا سوال یا اسی مقصد کے تحت کام کرنے والی دوسری تنظیموں کے ساتھ اس کے تعلق کی نوعیت وغیرہ۔ مجھے اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا کہ اقوام متحدہ کے زیر اہتمام اس تنظیم کی داغ بیل پڑے اور یہ اسی کی نگرانی میں پروان چڑھے اور نہ ہی "یونیسکو" کے ساتھ اس کے الحاق پر مجھے کوئی اعتراض ہو سکتا ہے لیکن میں اپنی اس خواہش کا بار بار اظہار کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ کہ یہ تنظیم ان افراد اور ان جماعتوں کے ذریعے معرضِ وجود میں آئے کہ جن کے دلوں میں امن کے لئے خیر سگالی اور محبت کا جذبہ موجزن ہو اور جو اس جذبہ کے زیر اثر امن کی خاطر اپنا وقت اور اپنا مال رضاکارانہ طور پر وقف کرنے کے لئے تیار ہوں۔ میں یہ کبھی نہیں مان سکتا کہ ایسے افراد اور ایسی جماعتیں ڈھونڈے

بھی نہیں مل سکتیں۔ اگر فی الواقعہ ایسے افراد اور ایسی جماعتیں دُنیا میں مفقود ہیں تو پھر امن کے متعلق ہماری اُمیدوں اور خواہشات کا اللہ ہی حافظ ہے لیکن عمل اور جد وجہد کے بغیر محض قیاس آرائی پر حصر کرتے ہوئے ہاتھ پہ ہاتھ دھر کر بیٹھ رہنا درست نہیں ہے۔

مجھے بارہا یہ خیال آیا ہے کہ تمام دُنیا کی یونیورسٹیاں ایک اہم فرض کی ادائیگی سے بالکل غافل ہیں۔ وہ فرض یہ ہے کہ یونیورسٹیوں کو ایسے اداروں کے طور پر کام کرنا چاہیئے کہ جن میں مختلف افکار تجزیہ کے بعد معین صورت اختیار کر سکیں۔ اگر اس بارے میں کوشش نہ کی جائے تو بھی افکار و نظریات کسی نہ کسی مرحلہ پر پہنچ کر معین صورت اختیار کر ہی لیتے ہیں لیکن ان کو ان کے حال پر چھوڑ دینے سے اوّل تو تجزیہ ہونے اور معین صورت اختیار کرنے میں بہت عرصہ لگتا ہے۔ دوسرے اِس بات کا امکان بھی رہتا ہے کہ بعض افکار کی مناسب طریق پر وضاحت ہی نہ ہو سکے۔ اور وہ مبہم حالت میں رہنے کے باعث کسی کام نہ آسکیں۔ یہ یونیورسٹیوں کا کام ہے کہ وہ ایسی مثالی تنظیموں کے قیام کے سلسلہ میں نمونہ قائم کریں کہ جن میں افکار و خیالات کو جمہوری اصولوں پر پرکھ کر ان کا تجزیہ کیا جا سکے۔ برطانوی یونیورسٹیوں کی گرانٹ کمیٹی کے صدر سر والٹر موبرلی (Sir Walter Moberly) نے یونیورسٹیوں کے بارے میں اسی قسم کی مایوسی کا اظہار کیا تھا لیکن ان کے پیشِ نظر صرف ایک ہی ملک کے حالات اور ایک ہی نوعیت کے مخصوص افکار و نظریات تھے دُنیا بھر کی یونیورسٹیاں بالعموم اور دُنیا کے اس حصہ کی یونیورسٹیاں بالخصوص جس میں کہ ہم رہتے ہیں اپنے دائرہ عمل کو محدود رکھنے کے جس روایتی رجحان کا شکار ہیں اس کو دُور کرنے کے سلسلہ میں "The Crisis in the University" کو ایک منفرد اور قابلِ قدر کوشش قرار دیا جا سکتا ہے۔ یونیورسٹیاں اکثر و بیشتر بے مصرف علم سکھانے اور اسے پھیلانے میں ہی مگن نظر آتی ہیں۔ یونیورسٹیوں کے دائرۂ عمل کے ایک حد تک محدود ہونے کا تو جواز ہو سکتا ہے لیکن جس حد تک ان کا دائرۂ عمل محدود ہے اس کا کوئی جواز پیش نہیں کیا جا سکتا۔ مسائل کو پرکھنے اور سائنسی طریق پر انہیں حل کرنے کے لئے جس ماحول اور جن مواقع کی ضرورت ہوتی ہے آخر وہ یونیورسٹیوں کے سوا اور کہاں میسر آسکتے ہیں؟ یہ صحیح ہے کہ یونیورسٹی سے تعلق رکھنے والے افراد بھی کسی حد تک تعصب کا شکار ہو سکتے ہیں اور ان سے روشنی کی بجائے گرمی اور تمازت کی توقع زیادہ کی جا سکتی ہے۔ بایں ہمہ یونیورسٹیوں سے تعلق رکھنے والے افراد دوسروں کی نسبت اس کام کو سرانجام دینے کی زیادہ اہلیت رکھتے ہیں۔ پس امن کے حصول کے لئے ذہنی فضا تیار کرنے کے سلسلے میں اگلا قدم یونیورسٹیاں ہی اٹھا سکتی ہیں۔ یہ یونیورسٹیوں کا کام ہے کہ وہ مستقبل میں ایک عظیم عالمی تنظیم کے قیام کو ممکن بنانے کیلئے اپنے ہاں اس نوعیت کی چھوٹی چھوٹی تنظیمیں بنائیں کہ جو نمونے کا کام دے سکیں۔ قبل اس کے کہ کوئی عظیم عالمی تنظیم معرضِ وجود میں آئے یونیورسٹیوں پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اس میدان میں رہنمائی کا فرض ادا کریں۔

آج امن کا مسئلہ ہماری فراست اور ہماری خیر سگالی کے حق میں ایک چیلنج کا حکم رکھتا ہے۔ نیچر سے تعلق رکھنے والے اور منفی نوعیت کے فلسفے خواہ کچھ ہی کیوں نہ کہیں میرے نزدیک انسان میں اتنی فراست اور خیر سگالی موجود ہے کہ وہ اس چیلنج کو قبول کر سکے۔ یہ انتہا درجے کی ناشکر گزاری اور ناسپاسی ہو گی کہ ہم اس امر کو فراموش کر بیٹھیں کہ خدا کی طرف سے ہم میں مطلوبہ فراست اور خیر سگالی کے اوصاف ودیعت کئے گئے ہیں۔ ہر چند کہ میرا یہ ایمان ہے کہ ہم اس حقیقت کو نہ تو کبھی فراموش کریں گے اور نہ کر سکتے ہیں۔ پھر بھی اگر فی الواقعہ ہم اس حقیقت کو فراموش کرنے پر تُلے ہوئے ہوں تو بنی نوع انسان کو اپنی اس ناشکر گزاری کی سزا بھگتنی پڑے گی اور وہ اس سزا سے کہیں زیادہ

البیان

قرآن مجید کا سلیس اردو ترجمہ مختصر اور مفید تفسیری حواشی کے ساتھ

سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَّاهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا

بے وقوف لوگ (بطور اعتراض) ضرور کہیں گے کہ ان مسلمانوں کو ان کے اس قبلہ سے کس چیز نے پھیر دیا جس پر وہ قائم تھے؟

عَلَيْهَا ۚ قُلْ لِلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَىٰ

کہہ دے کہ مشرق اور مغرب (یعنی سب جہات) خدا تعالیٰ کیلئے ہیں۔ وہ جسے چاہتا ہے صراطِ مستقیم

صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ۝ وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا

کی طرف رہنمائی فرماتا ہے[1] اسی طرح ہم نے تم کو (اے مسلمانو!) بہترین امت[2] قرار دیا۔ اور تمہیں ہر قسم کے افراط

شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا ۗ وَمَا

و تفریط سے بچایا تاتم لوگوں پر (اپنے نمونہ اور قول سے) گواہ بن سکو اور یہ رسول تم پر گواہ ہوگا۔ اے پیغمبر! ہم نے اس قبلہ کو

جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ الرَّسُولَ

جس پر تو تھا اسی لئے مقرر کیا تھا تاکہ ہم رسول کے سچے متبعین کو اپنی ایڑیوں کے بل

---

[1] مدینہ شریف ہجرت کرنے کے بعد پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام بامر الٰہی قریباً سولہ ماہ تک نماز میں بیت المقدس کی طرف منہ کیا کرتے تھے (بخاری شریف) پھر اللہ تعالیٰ نے خانہ کعبہ کی طرف منہ کرنے کا حکم دیا۔ اس طرح امتِ مسلمہ اسرائیلی اور اسمٰعیلی قبیلوں کے دونوں قبلوں کی جامع قرار پائی۔ اس تحویلِ قبلہ پر بعض کم فہم لوگوں نے اعتراض کئے۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب دیا ہے۔

[2] اُمَّةً وَسَطًا۔ وسط عربی زبان میں رہنمائی اور ہر قسم کی کمی بیشی سے پاک کو کہتے ہیں اور یہی افضل اور بہتر کی علامت ہے۔ اسی لئے وسطا کا

مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ ؕ وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ

پھر جانے والوں سے الگ کر دیں ۔ واقعی یہ بڑی مشکل آزمائش تھی ۔ مگر ان پر جنہیں اللہ تعالیٰ نے

هَدَى اللّٰهُ ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ

ہدایت دی ہے (یا بالکل آسان تھی) اللہ تعالیٰ تمہارے ایمانوں کو ضائع نہیں کر سکتا ۔ اللہ تعالیٰ سب لوگوں پر مہربان

لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝ قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ

اور رحم کرنے والا ہے ۔ ہم نے بار بار تیری توجہ کو آسمان کی طرف پھرتے دیکھا ہے ۔

فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۪ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ

ہم یقیناً تجھے اس قبلہ کا والی بنا دیں گے جسے تو زیادہ چاہتا ہے ۔ پس تو المسجد الحرام (خانہ کعبہ) کی طرف منہ کر نماز شروع

الْحَرَامِ ؕ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ؕ وَاِنَّ

کر دے ۔ اور اے مسلمانو! تم دنیا میں جہاں بھی ہو نماز میں اپنے منہ اسی خانہ کعبہ کی طرف کیا کرو ۔ جن لوگوں کو

الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ؕ وَ

صحیح طور پر علم کتاب دیا گیا ہے وہ جانتے ہیں کہ یہ حکم ان کے رب کی طرف سے برحق ہے ۔ اور

لفظ افضل کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے ۔ اللہ تعالیٰ دوسری جگہ فرماتا ہے کنتم خیر امۃ اخرجت للناس ۔

۱؎ تحویل قبلہ سے مخلص اور غیر مخلص میں امتیاز ہو گیا ۔ ایک قبلہ کو چھوڑ کر دوسرا اختیار کرنا سخت مشکل ہے ۔ یہ بات اللہ تعالیٰ کی ہدایت اور اس کے فضل سے ہی حاصل ہو سکتی ہے کہ انسان پر حق کھل جائے اور وہ اس کی اتباع کی توفیق پا لے ۔

۲؎ قریش مکہ کے بعض اعتراضات کے ازالہ کیلئے حضور علیہ السلام بار بار اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتے تھے ۔ ان کا ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ حضرت ابراہیم کے قبلہ خانہ کعبہ کی بجائے بیت المقدس کی طرف منہ کر رہے ہیں ۔ نیز یہ کہ مدعی نبوت ہو کر مکہ شریف سے نکالے گئے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ نے اس جگہ فتح مکہ کی بھی بشارت دی ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت کو ہمیشہ کے لئے خانہ کعبہ کیطرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم بھی دیدیا ۔

مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ○ وَلَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا

اللہ تعالیٰ ان کے کاموں سے بے خبر نہیں ہے ۔ اگر تو ان لوگوں کے پاس جنہیں پہلے

الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ وَمَا اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ

کتاب دی گئی ہے ہر قسم کا نشان لے آئے تب بھی وہ (اپنی ضد کی وجہ سے) تیرے قبلہ کی اتباع نہ کرینگے اور تو اب (بوجہ وحی الٰہی) انکے قبلہ

وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْ

اور اہل کتاب باہم بھی ایک دوسرے کے قبلہ کے پیروکار نہیں ہیں[1]۔ اور اب اگر تو اس الٰہی علم کے آجانے کے بعد ان کی خواہشات کا

بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ○ اَلَّذِيْنَ

تتبع کرے تو اس صورت میں تو ظالموں میں سے ہو جائے گا ۔ وہ لوگ جنہیں

اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ

ہم نے صحیح طور پر کتاب الٰہی کا فہم عطا کیا ہے وہ اس کو اسی طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں[2] تاہم ان میں سے

ع 17 لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ○ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ○

ایک گروہ کے لوگ حق کو چھپاتے ہیں حالانکہ وہ بخوبی آگاہ ہیں۔ یہ تیرے رب کی طرف سے حق و صداقت ہے تو شک کرنیوالوں میں سے نہ بن[3]۔

---

[1] یہود و نصاریٰ کا قبلہ الگ الگ ہے بلکہ یہود کے مختلف فرقے الگ الگ قبلہ کے قائل ہیں فلسطین میں یہودی فرقہ سامریہ بجائے یروشلم کے نابلس شہر کے پاس جرزیم پہاڑ کو اپنا قبلہ مانتے ہیں اور اسی جگہ جملہ عبادات بجالاتے ہیں اور وہاں ہی قربانگاہ بنا رکھی ہے۔ وما بعضهم بتابع قبلة بعض کہہ کر انہیں اپنے باہمی اختلافات کی طرف توجہ دلائی ہے۔

[2] بیٹے کی شناخت کچھ علامات سے ہوتی ہے اور اصل بنیاد بیوی کی پاکدامنی پر ہوتی ہے۔ اسی طرح نبی اور اس کی شریعت کی معرفت علامات کے رو سے ہوتی ہے اور ایک بڑا معیار اس مدعی نبوت کی دعویٰ سے پیشتر کی زندگی کا مسلّم طور پر پاک و بے عیب ہونا ہوتا ہے اسی کی طرف فقد لبثتُ فیکم عمرا من قبله افلا تعقلون (یونس ع ۲) میں توجہ دلائی گئی ہے۔

[3] لا تکوننّ میں لا نہی کا خطاب عمومیت کی صورت میں ہے اور نفی کا ہوگا جب یہ خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مخصوص ہو۔

قرآن مجید میں پردہ کے احکام اور ان کا مقصد

(از قلم محترمہ مبشرہ آمنہ خاتون صاحبہ سالٹ پانڈ گولڈ کوسٹ ۔ مغربی افریقہ)

ذیل کا قیمتی مضمون پردہ کے متعلق ہماری معزز اور واجب الاحترام بہن آمنہ خاتون صاحبہ نے مغربی افریقہ سے بھیجا ہے۔ آپ سالہا سال سے اپنے خاوند کے ہمراہ اس علاقہ میں خدماتِ دینیہ بجا لا رہی ہیں۔ (ایڈیٹر)

پردہ کے متعلق آئے دن اخبارات و رسائل میں بحث و تمحیص اور جرح قدح ہوتی رہتی ہے۔ جو کچھ بھی ہے کمی بیشی کی بحث کو الگ رکھ کر یہ تو ہر مسلمان کو ماننا پڑے گا کہ پردہ ایک انتہائی پُر حکمت حکم اللہ تعالیٰ کی طرف سے عورت کے لئے ہے۔ مگر سخت افسوس ہے کہ مسلمان عورتوں کی بیشتر تعداد حجاب کو خیرباد کہہ چکی ہے۔ بلکہ اب تو مردانہ سوسائٹیوں میں حصہ لینا یا مخلوط مجالس میں عورت کا شامل نہ ہونا فیشن کے خلاف تصور کیا جاتا ہے۔ اور اسلام کی محبت کا دعویٰ کرنے والے اس کے انجام سے آنکھیں بند کئے ہوئے ہیں۔ مگر وہ اقوام یا ممالک جو عورت کی آزادی اور بیباکی پر نازاں تھے اور اسلام پر پھبتیاں اُڑاتے تھے کہ اس نے پردہ کی قید لگا کر عورت پر سخت ظلم ڈھایا ہے ہی اب آزادی کے ہولناک نتائج سے آگاہ ہونے کے بعد بڑھتی ہوئی خرابیوں اور اُلجھنوں میں پھنس کر اس حد سے بڑھی ہوئی آزادی کو زہر ہلاہل خیال کرنے لگے ہیں۔ اور اس تباہ کن زہر کا جس نے انسانیت اور بہیمیت کے امتیاز کو مٹا کر نظامِ عالم کو درہم برہم کر کے رکھ دیا ہے۔ ان کے پاس کوئی تریاق اور کوئی علاج نہیں۔ مگر وہ خوش قسمت قوم جس کے پاس سراسر شفاء یعنی قرآن مجید ہے جس میں ہر مرض کا علاج اور ہر زہر کا تریاق موجود ہے وہ بھی دیگر قوموں کی تقلید میں اگر کسی خطرناک گڑھے میں گرنا چاہے تو اس کا کیا علاج۔

عورت کے پردہ کے متعلق حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام کا ایک فرمان "لیکچر لاہور" میں سے پیش کرتی ہوں۔ حضورؑ آریہ مذہب کے مقابلہ میں اسلام کی فضیلت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں :۔

> "گو آریہ صاحبوں کو اس زمانہ میں مسلمانوں سے کیسی ہی نفرت ہے اور اسلام کے عقائد سے کیسی ہی بیزاری ہے مگر برائے خدا پردہ کی رسم کو بکلی الوداع نہ کہہ دیں۔ کہ اس میں بہت سی خرابیاں ہیں جو بعد میں معلوم ہوں گی۔ یہ بات ہر ایک فہیم انسان سمجھ سکتا ہے کہ بہت سا حصہ انسانوں کا نفس امّارہ کے ماتحت چل رہا ہے اور وہ اپنے نفس کے ایسے قابو میں ہیں کہ اسکے جوشوں کے وقت کچھ بھی خدا تعالیٰ کی سزا کا دھیان نہیں رکھتے۔ جوان اور خوبصورت

عورتوں کو دیکھ کر بدنظری سے باز نہیں آتے اور ایسے ہی بہت سی عورتیں ہیں کہ خراب دلی سے بے گانہ مردوں کی طرف نگاہیں کرتی ہیں۔ اور جب فریقین کو باوجود ان کے اس خراب حالت میں ہوتے کے پوری آزادی دی جائے تو یقیناً ان کا وہی انجام ہوگا جیسا کہ یورپ کے بعض حصوں سے ظاہر ہے۔ ہاں جب یہ لوگ درحقیقت پاک دل ہو جائیں گے اور ان کی امارگی جاتی رہے گی اور شیطانی روح نکل جائے گی اور ان کی آنکھوں میں خدا کا خوف پیدا ہو جائے گا اور ان کے دلوں میں خدا کی عظمت قائم ہو جائے گی اور وہ ایک پاک تبدیلی کریں گے اور خدا ترسی کا ایک پاک چولہ پہن لیں گے تب جو چاہیں سو کریں کیونکہ اس وقت وہ خدا کے ہاتھ کے خوجے ہونگے گویا وہ مرد نہیں ہیں اور ان کی آنکھیں اس بات سے اندھی ہوں گی کہ نامحرم عورت کو بدنظری سے دیکھ سکیں یا ایسا بدخیال دل میں لا سکیں۔ مگر اسے پیارو! خدا آپ تمہارے دلوں میں الہام کرے ابھی وہ وقت نہیں کہ تم ایسا کرو۔ اور اگر ایسا کروگے تو ایک زہرناک بیج قوم میں پھیلاؤ گے۔ **یہ زمانہ ایک ایسا نازک زمانہ ہے کہ اگر کسی زمانہ میں پردہ کی رسم نہ ہوتی تو اس زمانہ میں ضرور ہونی چاہیئے تھی۔** کیونکہ کلجگ ہے اور زمین پر بدی اور فسق و فجور اور شراب خوری کا زور ہے اور دلوں میں دہریہ پن کے خیالات پھیل رہے ہیں اور خدا تعالےٰ کے احکام کی دلوں میں سے عظمت اٹھ گئی ہے۔ زبانوں پر سب کچھ ہے اور لیکچر بھی منطق اور فلسفہ سے بھرے ہوئے ہیں مگر دل روحانیت سے خالی ہیں۔ ایسے وقت میں کب مناسب ہے کہ اپنی غریب بکریوں کو بھیڑیوں کے بنوں میں چھوڑ دیا جائے۔" (لیکچر لاہور صفحہ ۲۷، ۲۸)

حضور کا مندرجہ بالا بیان موجودہ دور کی پوری ترجمانی کر رہا ہے۔ حضور نے اس میں جو فرمایا ہے آریوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ہے۔ کیونکہ اُس وقت مسلمانوں میں پردہ کی پابندی تھی۔ مگر اب ہمیں دیگر اقوام کے سامنے پردہ کی خوبیاں اور فوائد پیش کرتے ہوئے ندامت محسوس ہوتی ہے۔ کیونکہ عموماً یہ جواب سنا جاتا ہے کہ "مسلمانوں میں اب کون پردہ کرتا ہے؟"

اسلام کا خدا ایک پاک و مدبر ہستی ہے۔ اس کی بھیجی ہوئی پاک کتاب قرآن مجید ہے۔ جس کے ذریعہ وہ انسان کو نہ صرف ہر قسم کی بدیوں اور برائیوں سے بچنے کی تلقین کرتا ہے بلکہ تمام فتنوں اور برائیوں سے بچنے کے ذرائع اور طریقے بھی بتاتا ہے اور اس کی مثال دنیا کے کسی مذہب میں سوائے اسلام کے نہیں مل سکتی۔ قرآن کریم ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ تم برائیوں کے مبادیات اور محرکات سے بھی اجتناب کرو۔ اور اسی مقصد کیلئے اللہ تعالیٰ نے مردوں کے لئے **غضِ بصر** اور عورتوں کے لئے **غضِ بصر** کے علاوہ **اخفاءِ زینت** کا حکم صادر فرمایا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے :-

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ
اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ
ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ
بِمَا يَصْنَعُوْنَ ۔

ترجمہ :- مومن مردوں سے کہہ دو کہ وہ اپنی آنکھیں (بدی کی محرک چیزوں کو دیکھنے سے) نیچی رکھیں اور اپنی تمام راہوں کی (جن سے بدی کے داخل ہونے کا امکان ہو) حفاظت کریں۔ یہ بات ان کے لئے پاکیزہ تر ہوگی۔ اللہ تعالےٰ یقیناً اس بات سے باخبر ہے جو وہ کرتے ہیں یا کریں گے۔

اس کے بعد دوسری آیت میں عورتوں کے لئے حکم ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے تمام محرم رشتہ داروں کا ذکر فرما کر پردہ کی اہمیت کو اور بھی واضح کر دیا۔ کیونکہ اگر مرد عورت کے حکم میں فرق نہ ہوتا تو الگ آیت کی کیا ضرورت تھی۔ اور پھر اس تفصیل کا بیان کرنا کہ ان ان لوگوں کو مستثنیٰ رکھا گیا ہے یہ بھی (نعوذ باللہ من ذٰلک) بے معنی سا معلوم ہوتا ہے اسلئے ہر صاحب عقل پر اس طویل وضاحت سے عیاں ہوگا کہ پردہ ایک ضروری اور غیر معمولی چیز ہے۔

وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ
اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَ
لَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ
مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى
جُيُوْبِهِنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ
اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآئِهِنَّ اَوْ
اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآئِهِنَّ اَوْ
اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ
اَوْ بَنِيْٓ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ نِسَآئِهِنَّ
اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ اَوِ
التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ
مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ
لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ
وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ
مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ وَ
تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَا
الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝

ترجمہ :- اے نبی! کہدو مومن عورتوں سے کہ وہ (بدی کے محرکات کو دیکھنے سے) اپنی آنکھوں کو نیچی رکھیں اور اپنی تمام راہوں کی حفاظت کریں (جن سے بدی کے داخل ہونیکا احتمال ہو) اور اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں سوائے اس کے جو خود بخود ظاہر ہے۔ اور چاہیئے کہ اپنی اوڑھنیاں اپنے گریبانوں پر ڈال کر رکھیں اور اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں سوائے اپنے خاوندوں کے یا اپنے آباء کے یا خاوند کے آباء کے۔ یا اپنے بیٹوں کے یا سوتیلے بیٹوں کے یا اپنے بھائیوں کے یا بھتیجوں کے یا بھانجوں کے یا اپنی عورتوں کے یا غلاموں کے یا ان خادموں کے جو بہت بوڑھے اور

شہوت سے عاری ہوں یا ان لڑکوں کے
جو عورتوں کی مخفی باتوں سے واقف نہیں ہیں
اور اپنے پیروں کو زمین پر اس طرح مارکر نہ
چلیں جس سے ان کی مخفی زینت معلوم ہو۔
اور اے مومنو! تم سب اللہ تعالیٰ کی طرف
جھکو تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔"

اب مندرجہ بالا آیت میں وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ کی تشریح و توضیح کو زیر بحث لانا ہے کیونکہ یہی وہ خاص حکم ہے جس کے ماتحت پردہ کا حکم لازم آتا ہے۔

زینت سے مراد کیا چیزیں ہو سکتی ہیں

زینت سے اوّل تو قدرتی حسن اور جسمانی خوبصورتی مراد ہے۔ دوسرے خوبصورتی اور زینت کے اظہار کے مصنوعی طریقے یا سامان آرائش و زیبائش مثلاً زیورات خوبصورت اور اعلیٰ لباس یا وہ چیزیں جو دلکشی اور خوبصورتی کو بڑھانے کے لئے استعمال کی جاتی ہیں۔ اس زمانہ میں تو یہ چیزیں اَن گنت ہیں۔ اور یہ بات عورت کی فطرت میں داخل ہے کہ وہ کم و بیش مصنوعی آرائش و زیبائش کی بھی شائق ہوتی ہے اسلئے اسے تزیین سے روکا نہیں گیا بلکہ صرف ڈھانپنے کا حکم دیا گیا ہے اور اس زینت کے چھپانے کا نام اصطلاح عام میں پردہ یا حجاب ہے۔

بعض لوگوں کا یہ نظریہ ہے کہ سر اور چہرہ یا صرف چہرہ پردہ کے حکم میں شامل نہیں لیکن یہ خیال بالکل سطحی اور عقل کے خلاف ہوگا۔ سوچنے کا مقام ہے کہ اوّل تو چہرہ ہی ایسا حصہ ہے جو دوسرے کے لئے زیادہ باعث جذب و کشش ہو سکتا ہے اور بذات خود زینت ہے۔ اس کے علاوہ ظاہری سنگار اور زیب و زینت کا انحصار چہرہ اور بالوں پر ہی زیادہ ہوتا ہے۔ اور دُنیا بھر کے شاعروں نے محبوب کے چہرہ اور بالوں کی تعریف میں ہی صفحات سیاہ کر ڈالے تو کیا انہوں نے بے محل ہی ایسا کیا؟ اور کیا ایک مزین چہرہ اور آراستہ شدہ بال سب سے زیادہ فتنہ کا باعث نہیں ہو سکتے جبکہ یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ مرد کا طبعی میلان عورت کی طرف زیادہ ہوتا ہے اور انہی ابتدائی رجحانات سے بچنے کے لئے ہی پردہ کا حکم ہے۔

اِلَّا مَا ظَهَرَ سے کیا مراد لیا جا سکتا ہے

اس سے ایک تو وہ حصے مراد ہو سکتے ہیں جن کو چھپایا نہ جا سکے یا جس کے ڈھانپنے سے چلنے پھرنے میں دقت اور تکلیف کا سامنا ہو۔ بیماری کے وقت ڈاکٹری معائنہ کی ضرورت ہو۔ بعض مجبوریوں کے پیش نظر عورت کو روزی کمانے کے لئے اپنے بعض اعضاء کو کھلا رکھنا پڑے۔ اس طرح چہرہ کے متعلق بھی ہو سکتا ہے کہ آنکھیں دیکھنے کے لئے صرف ناک یا منہ سانس لینے کے لئے نہ ڈھانپا جائے لیکن موجودہ زمانہ کے ہلکے نقابوں میں اکثر کی بھی ضرورت نہیں رہتی۔ کیونکہ ان سے دیکھنے یا سانس لینے میں دقت وغیرہ نہیں ہوتی۔ مگر لَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ کی تعمیل میں سارا چہرہ کھلا رکھنے کی اجازت نہیں۔ نہ ہی سر اور چہرہ ایسے حصے ہیں کہ انہیں چھپایا جانا ناممکن یا دقت طلب ہے۔ البتہ اضطراری حالتوں میں یا بعض تعلیمی لائنوں مثلاً ڈاکٹری میں بعض وقت اشد مجبوری پیش آجاتی ہے اگر محض بعذر خدمت خلق کے ماتحت ایک عورت دوران تعلیم میں پردہ چھوڑنے کے لئے مجبور ہو تو یہ بھی اضطراراً ایک جائز حالت ہوگی مگر یہ نہیں کہ ہمیشہ کے لئے پردہ کو خیرباد کہدے۔

خمار کے لغوی معنے

مفردات راغب میں خمار کے معنے یہ دیئے گئے ہیں :-

اصل الخمر ستر الشیئ ویقال لما یستر بہ خمار ولکن الخمار صار فی التعارف رسماً لما تغطی بہ المرأة راسہا وجمعہ خُمُر۔ قال تعالیٰ وَلْیَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰی جُیُوبِهِنَّ۔

ترجمہ :- خمر کے اصل معنے کسی چیز کو ڈھانپنا ہے اور جس چیز کے ساتھ ڈھانپا جائے اسے خمار کہتے ہیں لیکن عرف عام میں خمار اسے کہتے ہیں جس سے عورت اپنے سر کو ڈھانپتی ہے۔ اس کی جمع خُمُر ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے وَلْیَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰی جُیُوبِهِنَّ۔

دوسری جگہ قرآن مجید میں پردہ کے لئے سورۂ احزاب کی یہ آیت ہے :-

یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَ
بَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِیْنَ
یُدْنِیْنَ عَلَیْهِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِهِنَّ
ذٰلِكَ اَدْنٰٓی اَنْ یُّعْرَفْنَ فَلَا
یُؤْذَیْنَ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ؁

ترجمہ :- اے نبی کہدو اپنی بیویوں سے اور بیٹیوں سے اور مومنوں کی عورتوں سے کہ اوڑھ لیا کریں وہ اپنے اُوپر بڑی چادروں کو اسلئے کہ آسانی سے پہچانی نہ جائیں اور ایذا سے بچ جائیں۔ اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔

اس آیت میں جلباب کا لفظ تشریح طلب ہے۔ تفسیر کشاف میں جلباب کے یہ معنے دیئے گئے ہیں :- الجلباب ثوب واسعٌ اوسعُ من الخمار ودون الرداء۔

.... جلباب اس لمبے چوڑے کپڑے کو کہتے ہیں جو اوڑھنی سے بڑا اور بڑی چادر سے چھوٹا ہو۔

ومعنی (یدنین علیھن من جلابیبھن) یرخینہا علیھن ویغطین بہا وجوھھن و اعطافھن - یُقال اذا زال الثوب عن وجہ المرأة اَدْنِی ثوبكِ علیٰ وجھكِ -

اور یُدنین علیھن من جلابیبھن کا مطلب یہ ہے کہ وہ لٹکا لیں (یا ڈال لیں) اپنے اُوپر اپنے جلباب اور اُن کے ساتھ اپنے چہروں کو اور اطراف کو ڈھانپ لیں جب عورت کے چہرہ سے کپڑا ہٹ جائے تو کہا جاتا ہے کہ اپنے کپڑے کو اپنے چہرہ پر ڈال لے۔ (تفسیر کشاف الجزء الثالث)

احادیث اور پردہ

اگرچہ بعض مفسرین نے ایک دو حدیثوں کی بنا پر یہ بیان کیا ہے کہ چہرہ پردہ میں شامل نہیں لیکن وہ حدیثیں اس پایہ اور اعتبار کی نہیں ہیں جن کا حوالہ میں پیش کروں گی اور جن سے ثابت ہوتا ہے کہ چہرہ کا پردہ بھی لازمی ہے۔

حدیث بخاری قرآن مجید کے بعد اصح الکتب مانی جاتی ہے۔ اسلئے اگر بخاری کی حدیث کے بالمقابل دوسری کوئی حدیث آجائے تو بخاری کی حدیث کو ہی ترجیح دی جائے گی۔ دوسرے یہ بات بھی تسلیم شدہ ہے کہ حضرت عائشہ رض کا درجہ علم حدیث اور تفقہ دینی کے بارے میں بہت بلند ہے۔ کبار صحابہ بھی حضرت عائشہ رض سے دینی مسائل دریافت کیا کرتے تھے۔ اور اُن کے قول کو بہت وقعت دیتے تھے۔ اور عورتوں کے متعلق مسائل میں تو انہیں خصوصیت سے اتھارٹی تسلیم کیا گیا ہے۔

چنانچہ آپؓ فرماتی ہیں (یہ حدیث بہت طویل ہے مگر اس کا اتنا حصہ بیان کرنا ضروری ہے جس سے پورا مطلب واضح ہو جائے)

حدثنی عُروۃ عن عائشۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہا زوج النبی صلی اللہ علیہ وسلم قالت کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم إذا أراد ان یخرُج أقرَعَ بین ازواجہ فایتھُنّ خرج سَھمُھا خرج بھا النبی صلی اللہ علیہ وسلم معہٗ ۔ قالت عائشۃُ فاقرع بیننا فی غزوۃٍ غزاھا فخرج سھمی فخرجتُ معَ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعد ما نزل الحجابُ وأنا أُحمَلُ فی ھَودَجی وأُنزل فیہ فسرنا حتّٰی اذا فرغ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من غزوتہ تِلکَ وقفل ودنونا من المدینۃ قافلین آذنَ لیلَۃً بالرحیل فقُمتُ حین أُذِنُوا بالرحیل فمَشَیتُ حتّٰی جاوزت الجیش فلما قضیتُ شأنی اقبلتُ الیٰ رحلی فاذا عقدٌ لی من جزعِ ظفارٍ قد انقطعَ فالتمستُ عِقدی وحَبَسنی ابتغاءہٗ واقبل الرھط الذین کانوا یرحلون لی فاحتملوا ھودجی فرحلوہ علی البعیر الذی کُنت رکبت وھم یحسبون انّی فیہ وکان النساء إذ ذاک خفافاً لم یُثقِلھُنّ اللّحمُ انما تاکل العُلقۃ من الطعام فلم یستنکر القوم خفۃ الھودَجِ حین رفعوہ وکُنت جاریۃً حدیثۃ السّنّ فبعثوا الجمل وساروا فوجدتُ عقدی بعد ما استمرّ الجیشُ فجئتُ منازلھم ولیس بھا داعٍ ولا مُجیبٌ فاتمتُ منزلی الذی کُنتُ بہ وظننتُ انّھم سَیفقدُونی فیرجعون إلیّ فبَینا أنا جالسۃٌ فی منزلی غلبتنی عینی فنمتُ ۔ وکان صفوان ابن المُعَطّل السّلمیّ ثمّ الذکوانیّ من وراء الجیش فادلج فاصبح عند منزلی فرأیٰ سواد انسانٍ نائمٍ فأتانی فعرفنی حین رآنی وکان یرانی قبل الحجاب فاستیقظت باسترجاعہ حین عرفنی فخمرتُ وَجہی بجلبابی ۔ واللہ ما کلّمنی کلمۃً ولا سمعتُ منہ کلمۃً غیر استرجاعہ ۔ الحدیث۔

(بخاری کتاب تفسیر القرآن سورۃ النور جلد ۲ صفحہ ۱۰۳ ۔ و کتاب المغازی حدیث الافک جلد ۲ صفحہ ۲۴)

ترجمہ :۔ عروہؓ نے بیان کیا کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ مطہرہ فرماتی ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب باہر جانے کا ارادہ فرماتے تو اپنی بیویوں کے درمیان قرعہ ڈالتے ۔ جس بیوی کے نام قرعہ نکلتا اسکو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھ لیجاتے ۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ایک غزوہ (غزوہ بنی مصطلق) کے موقع پر ہم میں قرعہ ڈالا گیا تو میرا نام نکلا ۔ پس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چلی گئی ۔ اس وقت آیت حجاب نازل ہو چکی تھی اور مجھے ہودج میں ہی (اونٹ پر) بٹھایا جاتا اور اسی میں اتارا جاتا ۔ ہم چلے گئے حتیٰ کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس غزوہ سے فارغ ہو کر لوٹے اور ہم واپسی کے وقت مدینہ کے قریب پہنچے تو رات کے وقت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے روانگی کا حکم دیا ۔ جب لوگوں نے کوچ کا اعلان کیا تو میں اٹھی اور لشکر میں سے گزر کر آگے چلی گئی ۔ جب میں قضاء حاجت سے فارغ

ہو کر اپنی جگہ پر واپس آئی تو دیکھا کہ میرا ظفار کے منکوں کا ہار ٹوٹ کر گر پڑا ہے۔ میں اپنے ہار کو تلاش کرتی رہی اس وجہ سے رُکی رہی۔ اتنے میں وہ لوگ جو میرے لئے پالان ڈالا کرتے تھے آئے اور انہوں نے میرا ہودج اُٹھا کر میرے اونٹ پر رکھ دیا جس پر میں سوار ہوا کرتی تھی۔ اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ میں ہودج میں ہوں۔ اس وقت کھانا وغیرہ کم ملنے کی وجہ سے عورتیں فربہ نہیں ہوتی تھیں ہلکی دُبلی ہوتی تھیں اسلئے لوگوں نے ہودج کے ہلکا ہونے کو محسوس نہ کیا۔ اور پھر میں ویسے بھی ان دنوں ابھی نوعمر لڑکی تھی (اس وجہ سے بھی ہودج زیادہ بھاری نہ تھا) انہوں نے اونٹ کو اُٹھایا اور چلے گئے۔ جب قافلہ آگے چلا گیا تو اُس وقت مجھے ہار ملا۔ میں جب قافلہ کے ٹھہرنے کی جگہ پر پہنچی تو وہاں کوئی نہ تھا۔ میں پھر اُس جگہ آئی جہاں میں ٹھہری ہوئی تھی۔ کیونکہ مجھے یقین تھا کہ وہ مجھے نہ پاکر جلدی تلاش میں واپس آئیں گے۔ میں وہاں بیٹھی ہوئی تھی کہ نیند نے مجھ پر غلبہ کیا اور میں سو گئی۔ صفوان بن معطل کو لشکر کے پیچھے چھوڑا جاتا تھا (تاکہ کسی گری پڑی چیز یا بھولے بھٹکے آدمی کا خیال رکھیں) وہ رات کے آخری حصہ میں پھرتے رہے اور جب صبح کے قریب میری قیامگاہ کے پاس پہنچے تو ایک سوتے ہوئے انسان کے وجود کو دیکھا اور جب نزدیک آئے تو مجھے دیکھ کر پہچان لیا کیونکہ انہوں نے مجھے نزولِ حجاب سے پہلے دیکھا ہوا تھا۔ مجھے پہچانکر جب انہوں نے انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا تو میں جاگ پڑی اور میں نے اپنے چہرہ کو اپنی چادر سے ڈھانپ لیا۔ خدا کی قسم انہوں نے میرے ساتھ کوئی بات نہیں کی اور نہ میں نے سوائے انا للہ وانا الیہ راجعون کے کوئی اور کلمہ اُن کے مُنہ سے سُنا۔"

اس حدیث سے صریح طور پر ظاہر ہے۔ کہ چہرہ ڈھانپنا ضروری ہے۔ ورنہ حضرت عائشہؓ کو یہ فرمانے کی کیا ضرورت تھی کہ میں نے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔ اور پھر یہ کہ صفوان بن معطلؓ نے انہیں نزول حجاب سے پہلے کا دیکھا ہوا تھا۔ اس لئے پہچان لیا۔

اس واقعہ سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں آیتِ حجاب کے اُترنے کے بعد تمام مسلمان خواتین اپنے چہروں کو ڈھانپا کرتی تھیں۔ یہ گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانہ کا تعامل ہے۔

پس یہ ایک واضح دلیل ہے کہ اسلام میں عورت کا چہرہ پردہ میں شامل ہے۔

ایک اور حدیث بھی جو حضرت عائشہؓ سے ہی مروی ہے اس امر کی تائید کرتی ہے وہ یہ ہے:۔

عن عائشة كان الركبان يمرون منا ونحن مع رسول الله (صلى الله عليه وسلم) محرمات فاذا جازوا بنا سدلت احدانا جلبابها من رأسها على وجهها فاذا جاوزونا كشفناه (رواه ابوداؤد مشكوٰة باب ما يجتنبه والمحرم)

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ حاجیوں کے قافلے ہمارے ساتھ گزرتے تھے اور ہم بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ احرام باندھے ہوئے ہوتی تھیں جب وہ ہمارے پاس سے گزرتے تو ہم میں سے ہر ایک اپنی چادر اپنے سر سے کھینچ کر مُنہ پر ڈال لیتی اور جب قافلے آگے گزر جاتے تو ہم چادروں کو ہٹا دیتیں۔"

إس حدیث میں حضرت عائشہؓ کے علاوہ دوسری ازواج مطہرات کا عمل بھی چہروں کا ڈھانپنا ثابت کرتا ہے۔
حضرت خلیفۃ المسیح اوّل فرماتے ہیں:۔

"ولیضربن بخمرھن علی جیوبھن - اوڑھنیوں کے گریبانوں پر ڈالنے کے یہ معنی ہیں کہ سر پر سے مُنہ کے سامنے گھونگٹ لٹکا کر گردن تک اس گھونگٹ کو لٹکا لو - پھر نظر بھی نیچی رہے گی۔"
(درس القرآن فرمودہ حضرت مولانا حکیم نور الدین خلیفۃ المسیح اوّلؓ صفحہ ۲۱۴ تفسیر سورہ نور)

"یُدْنِیْنَ عَلَیْهِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِهِنَّ لٹکا دیں اپنے اُوپر اپنی چادروں یعنی گھونگٹ کو چہرہ پر بڑھا کر رکھیں۔" (درس القرآن خلیفۃ المسیح اوّل صفحہ ۲۶۲ تفسیر سورہ احزاب)

سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح ثانی ایدہ اللہ بنصرہ العزیز زیر تفسیر وَقُلْ لِلْمُؤْمِنٰتِ فرماتے ہیں:۔

"اسی طرح مومن عورتوں سے کہدے کہ وہ اپنی آنکھوں کو نیچا رکھیں۔ اور تمام ان راستوں کو جن سے بدی کا خیال داخل ہوتا ہے محفوظ رکھیں اور اپنی زینت کو لوگوں پر ظاہر نہ کریں۔ سوائے اس کے جو خود بخود ظاہر ہو۔ اور چاہیئے کہ اپنی گردن، سر اور مُنہ کو کپڑے سے ڈھانکیں اور اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں۔" (احمدیت یعنی حقیقی اسلام صفحہ ۱۷۱)

اب حضرت اقدس خلیفۃ المسیح ثانی کے فرمودہ بیان میں بھی چہرہ کا ڈھانکنا ہی ثابت ہے اور حضور کے اہلبیت کا اسوہ بھی اس کے مطابق ہے۔ ساری جماعت احمدیہ کی مستورات سوائے شاذ کے چہرہ کو ڈھانکتی ہیں۔ پھر معلوم نہیں سلسلہ کے بعض افراد کو کیسے یہ جرأت پیدا ہوگئی کہ وہ چہرہ بلکہ سر کو بھی خارج از پردہ بیان کرنے لگے۔ مَیں نے اس قسم کا ایک مضمون سلسلہ کے ایک جریدہ میں پڑھا تھا۔ اسی وجہ سے مَیں نے چہرہ کے پردہ کو ثابت کرنے کی زیادہ کوشش کی ہے۔

اگر فرض کے طور پر یہ کہا جائے کہ قرآن کریم کی متذکرہ بالا آیات سے سر اور چہرہ کا پردہ ثابت نہیں ہوتا تو اوّل تو اس سے پردہ کی اصل غرض اور مقصد ہی زائل ہو جائیگا اور پھر عقل کیسے تسلیم کرے گی کہ قرآن کریم جیسی انتہائی پُرحکمت کتاب نے حجاب کا حکم نازل کیا مگر ایک ضروری اور اہم حصّہ کو حجاب سے خارج رکھا۔ اگر چہرہ حجاب میں شامل نہیں تو عیسائیوں کی ننز کا لباس بھی ایسا ہوتا ہے جس سے تمام جسم پورے طور سے ڈھکا ہوتا ہے اور صرف مُنہ ہی ننگا ہوتا ہے اسلئے ایک معترض کہہ سکتا ہے کہ اسلام نے پردہ کا حکم دیکر کوئی نئی بات پیش نہیں کی۔ اس کا جواب ہمارے پاس کیا ہوگا۔

اور ایک بات یہ بھی کہی جاتی ہے کہ اگر عورت کو چہرہ ڈھانپنے کا حکم ہوتا تو مرد کے لئے غضِ بصر کا حکم بے معنی ثابت ہوگا۔ لیکن یہ کہنا ہی عدم تدبر کا نتیجہ ہے۔ غور کریں کہ اگر قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے غضِ بصر کا حکم دیا ہے تو اس پر عمل صرف ایک مسلمان ہی کر سکتا ہے اور ساری دُنیا میں مسلمان ہی نہیں بستے کہ وہ غضِ بصر پر عمل کرتے ہوئے نیچی نظریں رکھینگے ایک غیر مسلم کو کیا افتاد پڑی ہے کہ وہ ایک مسلمان عورت کو دیکھنے سے غضِ بصر پر عمل کرے۔

قرآن مجید میں پردہ کے احکام اور ان کا مقصد

(بقیہ صفحہ ۲۴)

اور نہ ہی یہ ضروری ہے کہ ہر وقت ایک مسلمان مرد کے بالمقابل مسلمان عورت ہی ہو گی۔ اگر مرد کو غضِ بصر کا حکم دیا جاتا ہے تو ساری دنیا کی عورتوں کے لئے ہے جو ننگے منہ پھرتی ہیں صرف مسلمان عورتوں کے بالمقابل نہیں۔ ورنہ کوئی خاص سائن بورڈ ہونا چاہیئے جو ہر جگہ اور ہر ملک میں ایک مسلم اور غیر مسلم میں امتیاز ظاہر کرے۔

یہ بات بھی ناقابلِ تسلیم ہے کہ دیہات میں چہرہ کا پردہ نہ ہونے کے باوجود ناجائز واردات کم ہوتی ہیں کیونکہ عموماً سُننے میں یہی آتا ہے کہ ناجائز تعلقات وغیرہ کی بناء پر باہمی سر پھٹول، قتل اور اغوا کے واقعات زیادہ تر دیہات میں ہوتے ہیں۔ روزانہ اخبارات کی خبروں سے اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اور اگر بعض جگہوں میں ایسے واقعات نسبتاً کم ہوتے ہیں تو اس کی وجہ صرف یہ ہوتی ہے کہ جہاں برادری کا اثر اور رسوخ زیادہ ہو وہاں عموماً لوگ ایک دوسرے کے ڈر سے مجرمانہ حرکات سے باز رہتے ہیں کیونکہ حقہ پانی وغیرہ بند ہوجانے کا خوف ہوتا ہے یا انتقام کا خدشہ ایسے واقعات کو دبانے میں آڑے آتا ہے۔

اس کے علاوہ اگر چہرہ کے پردہ سے ہی عورت خطرناک اور متعدی امراض کا شکار ہوتی ہے تو مرد ان سے محفوظ ہونے چاہئیں حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ اور پھر دیہات کی عورتیں جو کھلے منہ کھلی ہوا میں پھرنے کی عادی ہیں کم از کم وہی بچی ہوتیں لیکن یہ بات بھی نہیں کیونکہ سِل دق اور دیگر متعدی امراض کے کیس دیہات میں زیادہ ہوتے ہیں۔

قرآن مجید نے جس حد تک عورت پر پردہ کی پابندی عائد کی ہے وہ ہرگز سختی یا قید نہیں کہلا سکتی بلکہ اس سے عورت کا وقار اور مرتبہ قائم کیا گیا ہے اس سے عورت کے مشاغل اور

دائرہ عمل کو محدود رکھا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے کسبِ معاش کو عورت پر فرض قرار نہیں دیا بلکہ یہ فرمایا ہے کہ الرّجال قوّامون علی النساء بما فضّل اللہ بعضھم علیٰ بعض وبما انفقوا من اموالھم یعنی مَردوں کو عورتوں پر حاکم اور منتظم بنایا گیا ہے کیونکہ ان پر اموال خرچ کرنے کی ذمہ داری مَردوں پر عائد ہے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ نیک اور صالح عورتیں وہ ہیں جو اپنی ذمہ داری کو سمجھتے ہوئے خاوندوں کی عزت اور مال کی کما حقہٗ حفاظت کریں۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ عورت اور مرد کے فرائض الگ الگ ہیں اور یہ ایک بہترین نظام ہے جو اسلام نے مرد عورت کی فطرت اور جبلّی طاقتوں کے مطابق پیش کیا ہے لیکن اسکے ساتھ ہی قرآن کریم نے عورت کو ضرورت اور مجبوری کے وقت کسبِ معاش سے منع نہیں فرمایا۔ اس کیلئے کئی ایسے ذرائع ہیں کہ پردہ کی حدود کو برقرار رکھتے ہوئے عورت کیلئے ان سے کسبِ معاش میں کوئی حرج نہیں۔ مگر فی زمانہ جو یہ فیشن ہو رہا ہے کہ جب تک ہر موقع پر مَردوں کے دوش بدوش اور ہر مجلس میں پہلو بہ پہلو عورتیں شامل نہ ہوں تو عورت کی حق تلفی ہو گی، عدم مساوات ہو گا۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ قطعاً غلط پہلو ہے جس کو اختیار کیا جاتا ہے۔ اسلام نے جس حد تک عورت کو آزادی اور دیگر حقوق عطا کئے ہیں وہی صحیح اور بہترین ہیں جن کو ہر عقل تسلیم کر سکتی ہے۔ اور ایک دیندار مسلمان عورت کا فرض ہونا چاہیئے کہ وہ اپنے مرتبہ اور وقار کو سمجھے اور جو ذمہ داریاں حقیقۃً اس پر عائد ہوتی ہیں ان کو پورے طور پر سمجھنے اور نبھانے کی کوشش کرے۔

ضروری اعلان

مکتبہ الفرقان سے جملہ کتب طلب کی جاسکتی ہیں۔
ٹریکٹ اور رسالہ جات بھی مل سکتے ہیں۔

مینجر

ایک نہائت اہم فتویٰ

شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی تحریر فرماتے ہیں:۔

"مودودی صاحب کا کتاب و سنت کا بار بار ذکر فرمانا محض ڈھونگ ہے۔ وہ نہ کتاب کو مانتے ہیں اور نہ سنت کو مانتے ہیں بلکہ وہ خلاف سلف صالحین ایک نیا مذہب بنا رہے ہیں اور اسی پر لوگوں کو چلا کر دوزخ میں دھکیلنا چاہتے ہیں۔" (رسالہ مودودی دستور اور عقائد کی حقیقت صفحہ ۴۶)

"بہائی تحریک کے متعلق پانچ مقالے"

جناب ایڈیٹر صاحب روزنامہ "نوائے وقت" لکھتے ہیں:۔

"ابوالعطاء جالندھری صاحب عقائد کے لحاظ سے احمدی ہیں۔ انہوں نے کوئٹہ میں بہائی جمعیت کو انکے عقائد کے بارے میں تنقیدی دعوت دی اور واپس نئی تحریک کے متعلق پانچ سیر حاصل مقالے احمدیہ مسجد کوئٹہ کے احاطے میں سنائے اور ساتھ ہی بہائیوں کو دعوت دی کہ وہ انکی تنقید و تنقیح کا جواب دیں۔ مؤلف کا دعویٰ یہ ہے کہ بہائی جمعیت انکا جواب نہ دے سکی۔ پہلا مقالہ بابی اور بہائی تحریک کی تاریخ سے متعلق ہے دوسرے مقالہ میں بہائیوں کے عقائد کا تحریک احمدیت سے مقابلہ کیا گیا ہے۔ تیسرا مقالہ جناب بہاء اللہ کے دعویٰ کی نوعیت سے بحث کرتا ہے۔ چوتھا مقالہ قرآنی شریعت کے دائمی ہونیکے متعلق ہے۔ اور پانچویں مقالہ میں قرآنی شریعت اور بہائی شریعت کا موازنہ کیا گیا ہے۔" (نوائے وقت ۲۲ جون ۱۹۵۶ء)

قیمت بارہ آنے - ملنے کا پتہ: مکتبہ الفرقان ربوہ

احمدیہ انٹرنیشنل پریس ایسوسی ایشن

یہ دنیا بھر کے احمدی اخبارات و رسائل کی مشترکہ انجمن ہے۔ جس کے نمائندے مشرقی و مغربی ممالک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ احمدی لوگ قانون اور نظام کے پابند ہیں اسلئے ان کا ہر ادارہ ملکی قوانین کا پورا پورا احترام کرتا ہے۔

احمدیہ انٹرنیشنل پریس ایسوسی ایشن کا مرکز ربوہ میں ہے جہاں پر تمام ممالک کے اخبارات و رسائل کی طرف سے مقررہ نمائندگان مل کر لائحہ عمل تیار کرتے ہیں اور گاہے گاہے ان کے اجتماعات ہوتے رہتے ہیں۔ پہلے سال ۵۶-۱۹۵۷ء کیلئے حسب ذیل عہدہ دار منتخب ہوئے ہیں:۔

پریذیڈنٹ ۔ ابوالعطاء جالندھری ایڈیٹر الفرقان

وائس پریذیڈنٹ ۔ روشن دین تنویر ایڈیٹر روزنامہ الفضل

سیکرٹری ۔ مظفر الدین چودھری ایڈیٹر ریویو آف ریلیجنز

نائب سیکرٹری ۔ قریشی مقبول احمد بی۔ اے

محاسب ۔ چودھری محمد شریف مولوی فاضل

(طابع و ناشر ابوالعطاء جالندھری نے ضیاء الاسلام پریس ربوہ میں چھپوا کر احمد نگر ربوہ ضلع جھنگ سے شائع کیا)